تجلیاتِ انجم

آنکھوں کا اشارہ ہے فقط حسنِ تکلم
لفظوں میں عبث حسنِ بیاں ڈھونڈ رہا ہوں

انجم [illegible]

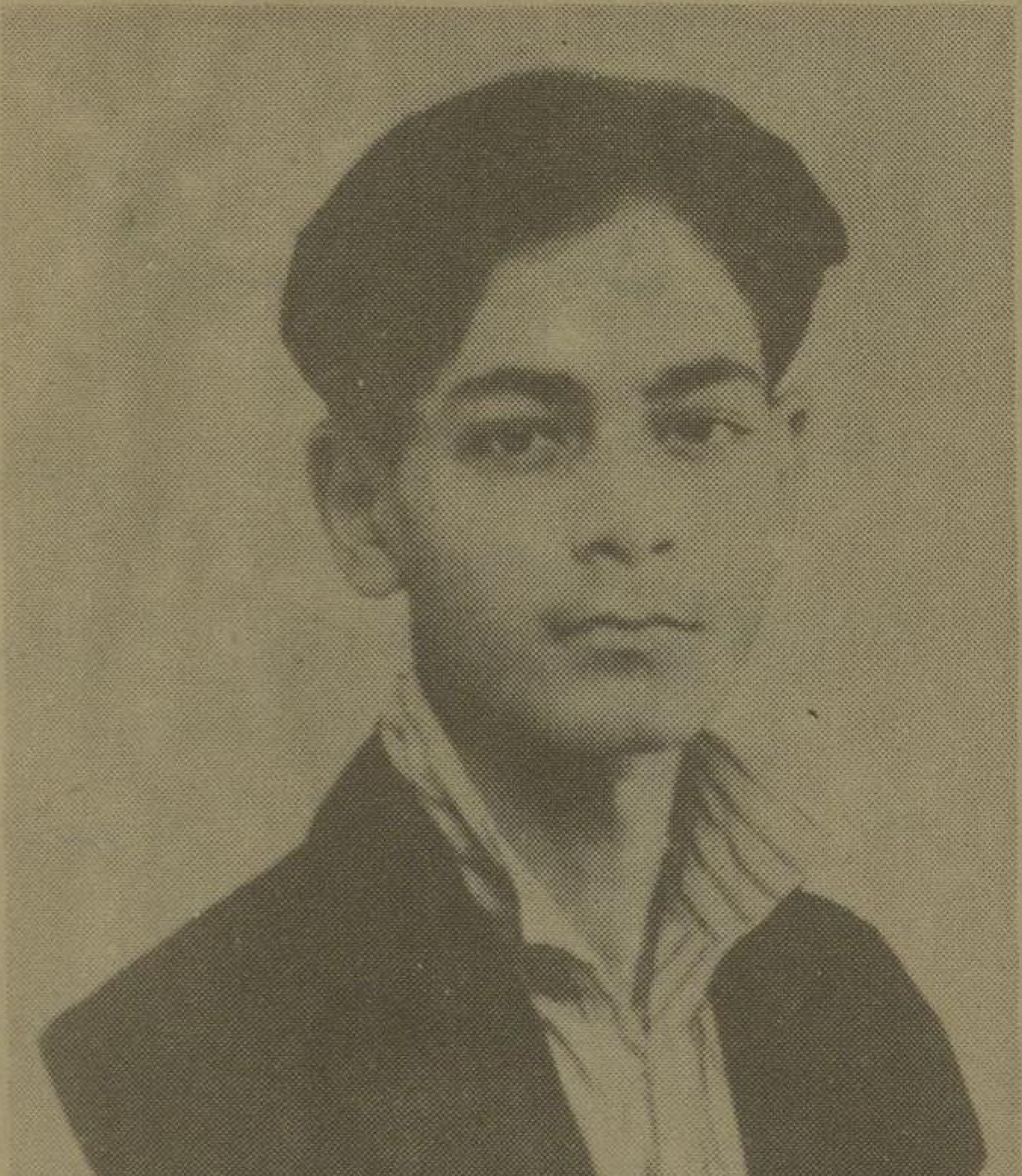
[illegible] سے کھیلتے ہیں
[illegible] ادوار تو مرادل ہو جائے

تجلّیاتِ انجم

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اپنے مرحوم بیٹے کی یادگار کے طور پر اس کا کلام عوام تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔

شائع کردہ سید امیر حسن اختر جعفری دگرامر ٹیچر) ریٹائرڈ
پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف ماسٹر
۲۰۔ ایچ۔ کوچہ میر دلی رضویہ سوسائٹی۔ کراچی

فہرست مضامین



سید علی سجاد انجم (مرحوم)



ایک ہونا بھی بڑی جرأتِ اخلاقی ہے ● ایک ہونے کی بدولت تو خدا باقی ہے

سید امیر حسن جعفری اخترؔ



ڈاکٹر سید منظور حسن جعفری شفا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

تجلیاتِ انجم

اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج میں اپنے اس دیرینہ خواب کی تعبیر پر دیباچہ سپردِ قلم کر رہا ہوں۔ جس خواب کو میں سمجھتا تھا کہ کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا اور جس کی وجہ سے مایوسی کے، اور اپنے لختِ جگر سے دل ہی دل میں شرمندگی کے بحرِ بیکراں میں ڈوبا چلا جا رہا تھا۔ یعنی "تجلیاتِ انجم" جو اس وقت جناب کے زیرِ نظر ہے آج سے بیس[۲۰] پچیس[۲۵] سال قبل سے اس کے مرتب کرنے کا اور طبع کرانے کا دل میں خیال جوش مار رہا تھا اور رہ رہ کر یہ خواہش دل میں خلش پیدا کر رہی تھی کہ مرحوم فرزند کی یہ یادگار ضرور معرضِ وجود میں آجانی چاہیئے۔ مگر دیر آید درست آید۔ اس کا وقت اب اس قدر دیر کے بعد آیا ہے۔ غالباً مشیئتِ ایزدی کو ایسا ہی منظور تھا کہ جتنی دیر اس کے ظہور میں آنے میں لگے۔ اتنی ہی یہ بلند و بالا ہو کر منصۂ شہود

پہنائے اور ایسا ہی ہوا ہے جیسا کہ اس کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا۔

تجلیاتِ انجمؔ میرے مرحوم منجھلے صاحبزادے سیّد علی سجّاد جعفری المتخلص بہ انجمؔ کی خداداد شاعرانہ صلاحیت کی تحریری منظم تصویر ہے جس نے اپنی عمر کے بائیسویں سال ہی میں داعی اَجل کو لبیک کہہ کر اس دار فانی سے سُوئے ملکِ جاودانی سفر اختیار کر لیا اور ملک الموت نے اس کی متاع روح لطیف سے کچھ اس قدر جلد توصل حاصل کر لیا کہ مجھے اس کے آخری دیدار کی بھی مہلت نہ دی۔ عزیزم مرحوم کے انتقال کے وقت میں بحیثیت پوسٹ ماسٹر ڈاک خانہ چھبڑہ ریاست ٹونک میں بہ سلسلہ ملازمت تعینات تھا اس کے انتقال پر ملال کی اطلاع اگرچہ مجھ کو اسی روز مل گئی تھی مگر وہ میرے پہنچتے پہنچتے اپنی آرام گاہِ مستقل میں جا سویا تھا اور اس کی یہ موت بھی دو ہی تین دن کے اندر اندر چٹ پٹ مرضِ ہیضہ میں واقع ہو گئی تھی جب کہ وہ آگرہ میں تھرڈ ایئر میں تعلیم پا رہا تھا اور چھٹیوں میں اپنے وطن اور گھر بھرت پور آیا ہوا تھا۔

ظاہر ہے کہ مشیّت ایزدی کے سامنے میری کیا مجال تھی کہ کچھ حرف شکایت زبان پر لاتا۔ بس اس کی بارگاہ میں سرِ نیاز جھکا دیا۔ عزیزم علی سجّاد انجمؔ مرحوم کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا دراصل یہ صلاحیت اس کو ورثہ میں ملی تھی اس لیے کہ اس کے دادا، دادی اور باپ سب میں شاعرانہ مذاق بہت بلند اور بہت اچھا تھا۔ انجمؔ مرحوم کے دادا یعنی میرے والد مرحوم سید مرتضیٰ حسن صاحب جعفری وکیل تھے۔ عربی

فارسی کے بڑے اچھے عالم تھے اور خداداد ملکۂ شاعری رکھتے تھے۔ چودھری نظیرالحسن فوقؔ (مصنف المیزان جو موازنۂ انیس و دبیر میں چوٹی کی کتاب ہے) اکثر والد مرحوم سے شاعری پر تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے۔ مجھے بڑا صدمہ اور افسوس ہے کہ والد مرحوم کا سارا کلام میرے بڑے بھائی صاحب سید رضی الحسن جعفری مرحوم کے پاس ہی رہا اور اس وقت میں اس کا نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ البتہ انجمؔ مرحوم کی دادی مرحومہ کا کلام چونکہ ان کی حیات ہی میں طبع ہو چکا تھا اس لئے وہ پیش کرتا ہوں۔ مرحومہ نے مشہد مقدس کا اپنا ایک سفرنامہ نظم میں لکھا تھا اور وہ ان کے چھوٹے لڑکے سیّد محمد حامد جعفری نے ان کی حیات ہی میں ان کو رضامند کر کے چھپوا دیا تھا۔ طرزِ بیان، زبان کی سادگی و شستگی اور صفائی، مضمون کا تسلسل اور اس کی افادیت، یہ سب باتیں پڑھنے سے ہی تعلق رکھتی ہیں یہ وہ پہلا کارنامہ ہے جو کسی خاتون نے اس موضوع پر پیش کیا ہو۔ چند اشعار اس کے بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

پس از حمدِ خلاق ہر دو سرا　　پس از نعت محبوبؐ ربّ العلا
پس از مدحت اہلِ بیتِ نبیؐ　　سفرنامہ مشہد کا ہوں لکھ رہی
سفر میں جو گذرا وہ لکھا ہے سب　　پڑھیں غور سے مومنات اس کو اب

قافلہ جب ایران پہنچا ہے تو اس کے متعلق اس طرح لکھا ہے

وہاں پر کیا ہم نے دو دن قیام　　جو سچ پوچھو تو یہ عجب ہے مقام
نئی چونکہ تھی یاں کی آب و ہوا　　نئی سب کی پوشاک تھی اور غذا

نیا طرز رہنے کا دیکھا یہاں — نیا ملک تھا اور نئی تھی زباں
عجب طرح کے یاں تھے رسم و رواج — نئی سلطنت تھی نیا تھا یہ راج
پسند آئی اس جا کی آب و ہوا — کیا نام دریافت اس ملک کا
ہوا تب یہ معلوم ایران ہے — بڑی اس لئے اس کی یہ شان ہے
پہلوی رضا شاہ ہی عالی جاہ — ہیں اس ملک کے آج کل بادشاہ

اسی سلاست زباں کے ساتھ مرحومہ نے از ابتدا تا انتہا اپنا تمام سفر اور سفر کے تمام چھوٹے بڑے واقعات بڑی خوبی کے ساتھ نظم فرمائے ہیں جن کی افادیت زائرانِ مشہد کے لئے بہت قابلِ قدر ہے۔

والدہ مرحومہ یعنی انجمؔ مرحوم کی دادی مرحومہ کی ایک مناجات بھی بہت پسندیدہ تھی۔ جس کو مرحومہ خود بھی بہت پڑھا کرتی تھیں وہ طبع تو نہیں ہو سکی لیکن اس کے چند بند میرے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ تبرکاً پیش کرتا ہوں۔

یا شیرِ کبریا دمِ مشکل کشائی ہے — آلام و غم کی قلب و جگر پر چڑھائی ہے
اب یہ کنیز دیتی تمھاری دہائی ہے — تم گر مدد کرو تو یقیناً رہائی ہے
اس کلفت و ملال سے دل آزاد کیجئے
مشکل کشائے کُل مری امداد کیجئے

حضرت کا لطف حال پہ میرے سدا رہا — عباس کا غلام مجھے آپ نے دیا
بیٹی کو بھی مسیحِ دو عالم نے دی شفا — بخشا ہے رزق اور کی اولاد بھی عطا
ارماں نکل گیا دلِ حسرت مقام کا
کیونکر ادا ہو شکر شہِ خاص و عام کا

پر اور بھی ہیں چند تمنائیں یا امام　　پھیریں نہ اپنے در سے مجھے آپ بے مرام
بعد نبی ہیں آپ ہی مختار لا کلام　　کون آپ کے سوا ہے مددگار خاص و عام
دل پر ہجوم رنج و الم ایک ساتھ ہے
اب میری آبرو شہ مرداں کے ہاتھ ہے

اس مناقب کا آخری بند ملاحظہ ہو۔

مولا مرے چمن میں ہمیشہ رہے بہار　　حاسد کا دل ہو خار ملامت سے داغدار
فیض کرم سے ہوں یہ برومند بار بار　　اے میرے بادشاہ ترے لطف کے نثار
ہر وقت آبیاری رحمت کمال ہو
پودا مرے ریاض کا ہر اک نہال ہو

اس ناچیز کو بھی شاعری کا شوق اوائل عمر ہی سے رہا ہے اور گھر کا ماحول بھی چونکہ شاعرانہ تھا اس لئے غیر شعوری طور پر طبیعت اثر پذیر ہوتی رہی اور موزونیت طبع انداز شاعرانہ میں لاشعوری طور پر ڈھلتی رہی زمانہ تعلیم میں زیادہ تر توجہ تعلیم کی طرف ہی مبذول رہی لیکن دوران ملازمت میں چونکہ اکثر اور بیشتر ایسے مقامات پر رہنا پڑا کہ جہاں موافق طبیعت دلچسپی کی صحبتیں بالکل مفقود ہوتی تھیں۔ اس لئے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے بعد شعر و شاعری ہی سے شغف رہتا تھا اور اپنی مشق سخن ہی میں دلچسپی محسوس ہوتی تھی، محکمۂ پوسٹ آفس کے چند من چلے اور خوش مذاق احباب نے پوسٹل ایڈوکیٹ کے نام سے محکمہ کی جانب سے ایک ماہانہ رسالہ دہلی سے جاری کر دیا تھا جس میں محکمہ کے متعلق تمام قسم کی معلومات فراہم

کی جاتی تھیں اتفاق وقت کہ محکمہ کی ایک تقریب کے سلسلے میں اس ناچیز نے بھی ایک نظم لکھ کر کارپردازان پوسٹل ایڈوکیٹ کو بھیج دی۔ نظم چونکہ اتفاق سے کچھ بہت ہی مناسب و موافق موقع ہو گئی تھی اس لیئے انھوں نے پوسٹل ایڈوکیٹ میں صرف شائع ہی نہیں کی بلکہ ایڈیٹر صاحب نے ایک بڑا لمبا چوڑا تعریفی نوٹ بھی اس کے ساتھ لگا دیا اور مجھے مسلسل اسی قسم کی منظومات بھیجتے رہنے کی تاکیدی فرمائش بھی فرمائی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جو میں نے ایک نظم ان کی خدمت میں ارسال کی تو جناب نے پوسٹل ایڈوکیٹ کے شمارہ نمبر ۷ بابت ماہ جولائی ۱۹۴۰ء میں مجھے مصوّرِ جذبات کے خطاب سے نواز دیا۔ چند اشعار آپ کی تفریح طبع کے لیئے پیش کرتا ہوں۔

زمزمۂ اتحاد

بعنوانِ محبت آج پھر صرفِ تکلّم ہوں
تخیّل کے ہیولے میں بہ شوقِ مدعا گم ہوں
برنگِ غنچۂ پژمردہ محرومِ تبسّم ہوں
سمائے انس پر ضوریز لیکن مثلِ انجم ہوں

مری آتش بیانی اک نئی دنیا بسائے گی
حجابِ خود فراموشیٔ ملّت کو اٹھائے گی

میں دہراتا رہوں گا سوزِ الفت کے فسانہ کو
کروں گا محرمِ سوزِ نہاں سارے زمانے کو
رکھوں گا شاخِ ملت پر میں اپنے آشیانہ کو
بنا ڈالوں گا صد گلزارِ جنّت ڈاک خانہ کو

دلِ دردآشنا دنیا میں پیدا کر کے چھوڑونگا
جمالِ شاہدِ مقصد ہویدا کر کے چھوڑونگا

اس کے بعد جو میں نے اپنی ایک نظم ان کو ارسال کی تو جناب ایڈیٹر صاحب نے حسب ذیل اپنا ایک نوٹ بھی اس کے ساتھ لگا دیا۔

پوسٹل ایڈوکیٹ ماہ ستمبر ۱۹۴۰ء شمارہ نمبر ۹۔ سید امیر حسن صاحب جعفری المتخلص بہ اختر کے نام نامی سے تو اب غالباً ہمارے تمام اردو خواں ناظرین اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں اس ماہ کے رسالہ میں ان کی ایک بالکل نرالی اور انوکھی طرز کی نظم بعنوان "ادغام کامل" ہدیۂ قارئین کی جاتی ہے۔

اختر صاحب کو ان اشعار کے نظم کرنے میں جتنی کاوش کرنی پڑی ہوگی اس کا ہمیں بدل اعتراف ہے۔ ردیف اس نظم کی دو بٹے تین (۲/۳) کسر میں ظاہر کی گئی ہے اور قافیہ جگر، نظر، بشر، سر وغیرہ ہے امید ہے کہ ناظرین ذوالاحترام اس جدت پسندی سے نہ صرف لطف اندوز ہی ہوں گے، بلکہ ایک قسم کا فخر محسوس کریں گے اس خشک اور بنجر محکمہ میں بھی ہر صنف کے اہل کمال موجود ہیں (ایڈیٹر)

عشق میں شق ہے مرا قلب و جگر ۲/۳ ۔۔۔ پر ہوں خاموش کہ ہے شور میں شر ۲/۳

طے ہو خاموشی سے تکمیلِ وفا کی منزل ۔۔۔ کیونکہ ہر شہر میں موجود ہے شہر ۲/۳

آپ بھی دل سے اگر جد و جہد فرمائیں ۔۔۔ زیر بھی ہوں تو یقینی ملے زر ۲/۳

یا علی کہہ کے اگر زور لگا یا مل کر ۔۔۔ ماحصل زور کا ہم پائیں گے زر ۲/۳

دیکھو جب چاہتی ہے کاٹنا پر کو تلوار ۔۔۔ چھانٹ لیتی ہے سپر میں سے بھی پر ۲/۳

سب اگر چاہیں تو ادغام ہو کامل فی الفور ۔۔۔ کیونکہ موجود دلِ شر میں بھی ہے شر ۲/۳

بخدا صابری وہ رہبر کامل ہے جسے ۔۔۔ حل ہر اک حال میں آتا ہے نظر ۲/۳

پھر خیالات میں احباب تفرق کیسا ۔۔۔ قرب میں ملتا ہے رب آپ کو گر ۲/۳

کیا میں کرتا کبھی اسرارِ محبت افشا — قلب خود لب ہی نہ بن جاتا اگر ۲/۳

شک نہیں اسمیں کہ ہے مفلسی دنیا میں بلا — سیم میں بھی ہے مگر سم کا اثر ۲/۳

ڈوب کر بحرِ تفکر میں ہوا یہ حاصل — نظر آنے لگا ہر بحر میں بر ۲/۳

کیوں نہ دل بہلے بھلا سیرِ چمن سے اپنا — من ہمیشہ سے چمن میں ہے اگر ۲/۳

فصل گل آئی ہے اب چلنا ہے گلشن کی طرف — دم قدم میں نظر آتا ہے مگر ۲/۳

یوں ہوں میں شانہ کش گیسوئے ادغام اختر
بل ہر اک بال میں آتا ہے نظر ۲/۳

میرا رجحانِ شاعری دراصل زیادہ تر مذہبیاتی رہا ہے اور مرثیہ سلام نوحے وغیرہ لکھنے سے ہی زیادہ دلچسپی رہی ہے اکثر مجالس اور مسالموں میں حصّہ لیتا رہا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک مسالمہ میں یہ سلام پیش کیا تھا جو بہت پسند کیا گیا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

سلام

تھی فوج شام صبح سے اکبر کے سامنے — ذرّے ہوں جیسے ماہِ منور کے سامنے

جانا یہ سب نے آئے پیمبر پئے دغا — اکبر جو پہنچے فوجِ ستمگر کے سامنے

گھوڑا اڑا کے رن میں جو عباس آگئے — ہوش ہر پرے کے اڑ گئے صفدر کے سامنے

بپھرا جو شیر جا کے ترائی میں دم لیا — جاں سے گیا جو آیا دلاور کے سامنے

چار آئینہ جو پہنے تھے دو ہو کے گر گئے — ٹھہرا نہ ایک تیغ دو پیکر کے سامنے

مڑ کر بھی دیکھنے کی تو ہمت نہ پھر پڑی — روباہ ایسے بھاگے غضنفر کے سامنے

جائے گریز جن کو نہ آئی وہاں نظر
مضطر کھڑے تھے دلبرِ حیدر کے سامنے
ششدر تھا میر فوج جو کی چار سو نگاہ
رخصت جو اس خمسہ تھے صفدر کے سامنے
مداح پنجتن کے ہیں مشتاق ہشت خلد
اختر کا رتبہ دیکھنا داور کے سامنے

ایک مرتبہ اپنے وطن بہر سر میں امام آخر الزماں کی ولادت کے سلسلہ میں ایک محفل قصیدہ خوانی میں میں نے بھی ایک قصیدہ پیش کیا تھا جس کے تین بند ملاحظہ فرمایئے۔

ہے بھر تیور کی قسمت میں بہر سر گلشن
باعث فخر رہا خلق میں اپنا یہ وطن
تھا یہاں فضل رسول دوسرا سایہ فگن
یوں دکھایا تھا نسیم سحری نے جوبن
جعفری پھول یہ مہکے کہ مہکتے ہی رہے
بلبل باغ سخن روز چہکتے ہی رہے

میں بھی اس باغِ فصاحت کا شجر ہوں اختر
بحر مواجِ بلاغت کا گہر ہوں اختر
گلشنِ مرتضوی کا گلِ تر ہوں اختر
فاطمی برج شرافت کا قمر ہوں اختر
معدن علم ہوں میں مخزن حکمت میں ہوں
اب بہر سر کے لئے باعث شہرت میں ہوں

طبع موزوں کو دیئے حق نے مضامین نفیس
فضل خالق سے رسا عقل ملی طبع سلیس
ہے فصاحت بھی بلاغت بھی سخن کی جو انیس
ملک مضمون کا بنایا مجھے خالق نے رئیس
دل سے ہر وقت دعا مونس فن دیتے ہیں
جتنے عارف ہیں وہ سب دادِ سخن دیتے ہیں

حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کی شان میں چند اشعار بے نقط بطور سہرے کے لکھے تھے ملاحظہ ہوں:۔

مصدر علم کا سرکار محمدؐ کا کمال | مصرع ہو علم کا در علم کا ہو گھر سہرا
ہو مکمل کہ ہو مداح ہر اک اہل ولا | ہمسر روح ارم ہو وہ معطر سہرا
ہو وہ سہرا کہ ہو سردارِ دو عالم سر در | اور ہو اہل ولا کو وہ مطہر سہرا
سالک راہ ولا دولہا ہو گر مستِ علی | حاصل طور ہو واللہ سراسر سہرا

ایک اور قصیدہ حضرت علی کی شان میں لکھا تھا جو پسند خاطر احباب ہوا، ملاحظہ ہو۔

گھر سے خالق کے ہمیں رہبر ملا | شہر علم مصطفیٰ کو در ملا
اور ملتا بھی کہاں زوجِ بتول | حق کے گھر داماد پیغمبر ملا
کس نے یہ انگڑائی گہوارے میں لی | کس کا یہ چیرا ہوا اژدر ملا
صف الٹ جائے جو الٹیں آستیں | آج پیغمبر کو وہ صفدر ملا
جس کی خاطر طور پر موسیٰ گئے | آج وہ جلوہ خدا کے گھر ملا
ہو گیا بے پردہ رازِ حسن و عشق | مصطفیٰ سے مرتضیٰ آ کر ملا
جب چلے مرحب کا سر لے کر علی | شرم سے خم ہر سرِ خودسر ملا
رتبۂ مداح حیدر دیکھ لو | مدح خوانی کے لئے منبر ملا
فکرِ اختر کا جو مرکز تھے علی | شعر ہر اک نور کا پیکر ملا

ایک دوسری محفل میں حسب ذیل قصیدہ پیش کیا تھا

بنائی خالقِ اکبر نے کیا تقدیر کعبہ کی | ہوئی دستِ خلیل اللہ سے تعمیر کعبہ کی

خدا کا گھر بنا اللہ رے توقیر کعبہ کی　　　بڑھادی اور وجہ اللہ نے تنویر کعبہ کی

بہر عنواں بنے مشکل کشا ہو کر یہاں پیدا

نبی کے گھر میں بیٹی ہو تو شوہر ہو کہاں پیدا

علی ہیں مالک کون و مکاں اور ساقیٔ کوثر　　　علی سردار جنت ہیں علی ہیں دین کے رہبر

علی دست خدا ہیں اور علی ہیں نفس پیغمبر　　　شب ہجرت جبھی نیند آگئی احمد کے بستر پر

رہا تکیہ خدا پر چین سے سوئے سر بستر

اسی سونے کا تمغہ تھا کہ پائی مرضیٔ داور

علی نقطہ ہیں بسم اللہ کا قرآنِ اطہر میں　　　علی قرآں کی صورت آئے آغوش پیمبر میں

ہوئی آغوش کعبہ دایہ تھے جب بطنِ مادر میں　　　نہ ہوتے کیوں تولد پھر علی اللہ کے گھر میں

جلیں گر دیکھ کر حاسد جلیں توقیر حیدر کی

مکاں والے کی مرضی اور پھر تقدیر حیدر کی

جناب فاطمہ زہرا رسول اللہ کی دختر　　　کہے ٹکڑا رسالت کا جسے خود حق کا پیغمبر

بتاؤ تو ہی اس سے بھلا پھر کون ہو بہتر　　　خدا کے گھر میں پیدا ہو تو ہو اس کا کوئی ہمسر

تھی زوج فاطمہ کے واسطے تعمیر کعبہ کی

بنا جب مقصد کعبہ بنی تقدیر کعبہ کی

کراچی پہنچنے کے بعد بہرت پور اور بھرتپور کے مسلمانوں کے قتل و غارت اور ان کو ریاست سے نکالنے کے پر درد اور ہولناک واقعات کو بھی میں نے اپنی ایک نظم "آئینۂ عبرت" میں قلمبند کیا ہے اس مقام پر میں اس کو بھی اس غرض سے نقل کر رہا ہوں کہ آئندہ آنے والوں کو اس میں کچھ تاریخی منظر نظر آجائے۔

آئینۂ عبرت

آئینۂ عبرت ہیں یہ پائندہ روایات — یوں ضبط قلم کرتا ہوں کچھ ہند کے حالات
جب ہند کی تقسیم کا طے ہو گیا مسئلہ — والیٔ بھرتپور کے فاسد ہوئے خیالات
ہونے لگے ہر گاؤں میں مقتول مسلمان — اک قصبہ پہرسر ہے جہاں رہتے تھے سادات
یہ قصبہ بھرتپور کی ریاست میں ہے مشہور — ہر دور میں گزرے ہیں یہاں اہل کمالات
خود غور کے سلطان نے سادات کو بخشا — راجہ کے بھی ان پر تھے ہمیشہ سے عنایات
اس گاؤں کو بھی گھیر لیا جاٹ نے آکر — کفار کے نرغہ میں تھا یہ قصبۂ سادات
ہتھیار بھی موجود تھے سب فضل خدا سے — اک قلعۂ محکم تھے پہرسر کے مکانات
وہ مورچہ بندی تھی کہ تمہید ظفر تھی — اسلام کی تاریخ کے دہرا دیئے صفحات
جب بھاگ گئے جاٹ تو فوجِ ستم آئی — باقاعدہ ساتھ اپنے لئے حرب کے آلات
تدبیر لعینوں کو مگر راس نہ آئی — مجبور ہر اک طرح ہوئے بانیٔ بدعات
دو دن میں ہوئے چار سو مقتول وہ خود سر — ہر وقت اجل سر پہ تھی اور دل میں بخارات
ہر رکن ریاست کا پریشان تھا از حد — دیوان نے کی فوج سے پھر آکے یہ اک بات
سادات کی بستی پہ چڑھائی کی غضب ہے — راجہ کے نہ تھے تم کو کبھی ایسے ہدایات
پہنچا دیئے پھر آگرہ وہ سب بحفاظت — ہر طرح سے ہوتی گئی رستہ میں مدارات
مشکور نہ کیوں راجہ کے ہوتے یہ مہاجر — اس طرح کرے جب کہ وہ اظہار عنایات
جب ہو گئی اس طرح سے تجدید محبت — طرفین ادا کرتے تھے الفت کے رسومات
پھر آگرہ خود راجہ نے پیغام یہ بھیجا — اب ہند حقیقت میں ہے دنیائے خرابات

تم شانِ ریاست ہو بھرتپور ہیں آؤ | ہر طرح کی حاصل تمھیں اب ہونگی مراعات
احساں ہیں ریاست پہ بزرگوں کے تمھارے | میں بھول نہیں سکتا کبھی سابقہ خدمات
میں جاں کا اور مال کا تم سب کے ہوں ضامن | کچھ غم نہیں ہوں گرچہ ریاست میں فسادات
جو صاحبِ ثروت تھے بھرتپور وہ آئے | ہر فرد بشر خوش تھا تو شاداں تھی ہر اک ذات
راجہ نے کہا تم سے ہی رونق ہے یہاں کی | تم آگئے مشکور ہوں میں رکھ لی مری بات
جب ماہ ستمبر کا ہوا دوسرا ہفتہ | کہنے لگا راجہ کہ دگرگوں ہوئے حالات
اب جلد تمھیں بھیجدوں واپس تو ہے بہتر | ایسا نہ ہو پھر تم کو ہوں کچھ مجھ سے شکایات
پستول وغیرہ نہ لے ہمراہ کوئی بھی | جائیگی پولس ساتھ کہ نازک ہیں یہ لمحات
یہ کہہ کے کیا لوریوں میں ان کو روانہ | رارہے کو نگر بھیجدیئے پہلے سے بندات
رکوائیں وہاں لوریاں افسر نے پولس کے | اب سنئے ذرا غور سے راجہ کی یہ حرکات
بندوق سے تیغوں سے سنانوں سے تبر سے | خود قتل کرائے وہیں ذی مرتبہ سادات
لاریب وہ تھے صاحبِ اعزاز و لیاقت | سب اہلِ وطن روتے ہیں اس قتل پہ دن رات
اس ظلم کو تاحشر نہ بھولیں گے کبھی ہم | دے اس کی سزا جلد خدا انکو بس اک سات
نابھہ ہو کہ پٹیالہ بھرتپور کہ الور | ہیں واقعے ہر جا کے قیامت کی حکایات
رلوائیں گی مسلم کو سدا خون کے آنسو | پنجاب، بہار اور وہ دہلی کی روایات
ہیں لرزہ براندام ملائک بھی فلک پر | اور گریہ کناں رنج سے افلاک کے طبقات
فرمائیں اگر غور ذرا اہلِ بصیرت | آئینۂ عبرت ہیں یہ اخترؔ کے مقالات

الغرض یہ تھا وہ خاندانی اور گھر کے ماحول کا اثر جو انجمؔ مرحوم کو ورثہ میں ملا تھا اور جو اس پر اثر انداز بھی ہو رہا تھا اور جس اثر کے زیرِ اثر ہی اس

کی طبیعت کا یہ حال تھا کہ ایک ایک دن میں ایک ایک مرصع نظم اور ایک ایک گھنٹے میں ایک ایک مرصع غزل تیار ہو جاتی تھی۔ متھرا میں ہونے والے آل انڈیا بیت بازی کا شیلڈ جیتا۔ وہ اس قدر زود گو تھا کہ غزل کی غزل فی البدیہہ کہتا چلا جاتا تھا اور ہر شعر پہلے شعر سے بڑھا ہوا ہی ہوتا تھا اس میں یہ صلاحیت شعری اور موزونیت طبع خدا کی دی ہوئی کچھ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اس نوخیزی کی شاعری پر مجھے ایک قسم کا فخر محسوس ہوتا تھا اور اکثر اپنی تسکین طبع کے لئے امتحاناً اس سے شعر کہلوایا کرتا تھا۔ ہونہار بیٹے کے مرنے کا باپ کو جس قدر بھی صدمہ ہوتا ہے وہ تو غالباً سب جانتے ہیں لیکن اس مخصوص اور اعلیٰ جودت طبع کے جدا ہو جانے نے مجھے اس قدر صدمہ دیا کہ گویا زندہ درگور ہی کر دیا۔ عرصہ تک تو مجھے اس غم نے کچھ سوچنے سمجھنے سے ہی غافل رکھا اور میں ایک عالم بے توجہی میں اپنی زندگی کے مشاغل میں لاشعوری طور پر چلتا رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد انجمؔ مرحوم کے کاغذات اور کتابوں میں سے ایک مجلد کاپی اس کے ہاتھ کی خوشخط لکھی ہوئی ملی جس کے سرورق پر ہی مسودہ کا نام "تجلیات انجمؔ" اس کے خود قلم کا جلی اور خوشنما حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ طبیعت دیکھ کر بھر آئی اور تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی ذہن اب بجائے رنج و صدمہ کے دوسری طرف منتقل ہو گیا اس کاپی میں چند نظمیں اور کچھ غزلیں اس کی خود کی لکھی ہوئی ملیں اور کچھ متفرق اشعار اس کے دوست شاعروں سے بھی دستیاب ہو گئے اور یہ کل مجموعہ اس قابل نظر آیا کہ ایک چھوٹا سا کتابچہ مرتب ہو سکے اس لئے یہ ارادہ دل میں کر لیا کہ اس کے اس کلام

کو لبطور یادگار زیور طبع سے آراستہ کرا دوں۔

دل میں اگرچہ خواہش طبع کرانے کی تھی مگر پاکستان آ کر کچھ عرصہ کے بعد ہی یہ کوہ الم ٹوٹ پڑا کہ میرا چھوٹا لڑکا یاور حسن جعفری علیل ہو گیا بہت کچھ علاج کرایا مگر وہ بھی ہم سے جدا ہو گیا اور اب صرف ایک بڑا لڑکا سید علی ناصر جعفری رہ گیا مگر ؎

قسمت کی بدنصیبی کو صیاد کیا کرے　　سر پر گرے پہاڑ تو فریاد کیا کرے

ابھی یاور مرحوم کے غم سے نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ علی ناصر نے بھی اپنی جان عزیز مالک جسم و جان کو سپرد کر دی اور ماں باپ کو چھوڑ کر راہی ملک عدم ہو گئے ان کے انتقال کے صدمے نے مجھے بالکل ہی بے دست و پا کر دیا۔ چونکہ اس واقعہ سے دماغ بالکل ماؤف سا ہو گیا۔ اس لئے تجلیات انجمؔ کے طبع کرانے کا خیال یکسر ذہن سے غائب ہو گیا۔

چونکہ علی ناصر جعفری بھی خداداد شاعری کے ملکہ سے سرفراز تھے اور تبسمؔ تخلص کرتے تھے اور ان کے لکھے ہوئے مراثی میرے پاس موجود تھے اس لئے ذہن اس طرف منتقل ہو گیا۔ چنانچہ سید علی اطہر صاحب جعفری اطہرؔ ریٹائرڈ نائب تحصیلدار کی مدد سے میں نے　　علی ناصر جعفری مرحوم کے مراثی بعنوان اشک تبسم طبع کرا دیئے۔

مرحوم علی ناصر جعفری کی عمر بھی ابھی ۲۸ سال کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ پیغام اجل نے آ کے دستک دی۔ ظاہر ہے کہ پختگی کلام کے لئے ایک عمر چاہیئے بایں ہمہ ان کے کلام میں بھی وہی پختگی نظر آتی ہے جو ایک کہنہ مشق

استاد کے کلام میں ہو سکتی ہے۔ نمونے کے طور پر چند بند ان کے مرثیہ کے پیش کرتا ہوں۔

جناب حُرؑ کے مرثیے میں حرؑ کا خواب اس طرح لکھا ہے :۔

سو رہا تھا یوں ہی تقدیر سے غافل ہو کر
بخت بیدار نے اک طرفہ دکھایا منظر
خواب میں دیکھا وہ عالم جو نہ تھا پیشِ نظر
یک بیک چونک اٹھا کھل گئی چشم صفدر
کھل گئی آنکھ وہ بند آنکھوں سے منظر دیکھا
خواب میں، جاگتے اک بار مقدر دیکھا

اس مقام پر ساقی نامہ میں لکھتے ہیں :۔

خیر منظور نہیں تجھ کو اگر یہ صورت
مجھ کو کوثر میں ڈبو دے کہ مٹے سب جحت
تو اس زیست سے بہتر ہے کہ نکلے حسرت
پھر تو سب لوگ کہیں مجھ کو غریقِ رحمت
کیا ہی میخانۂ جنت سے تماشا نکلے
موج کے دوش پہ اک دھوم سے لاشہ نکلے

پھر اسی ساقی نامہ میں بعد تین بند کے تحریر کرتے ہیں

تو نے کعبہ سے کیا نقشِ بتاں کو نابود
ہو گیا تیرا زچہ خانہ ہمارا مسجود
ساقیا تو نہ پلاتا جو ہمیں جام شہود
پھر نہ بندہ کوئی ہوتا نہ کوئی تھا معبود
ہم تصدق سے ترے عرشِ علا تک پہنچے
سجدہ کر کے ترے مولد کو خدا تک پہنچے

غرض کہ کلام مبہم شائع ہوا اور میرا ذہن صدمات کو فراموش کر کے کچھ ہلکا ہوتا جا رہا تھا کہ میری شومئی قسمت نے ایک اور غم کا پہاڑ توڑا یعنی میری رفیقۂ حیات نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا اور جنت جا بسائی ۔ اب دنیا آنکھوں

میں اندھیر ہو گئی۔ اب سوائے خدا کی ذات کے کوئی یار و مددگار نظر نہیں آتا تھا بس خانۂ تنہائی میں گوشہ گیری میں زندگی گزرنے لگی ۔ دل اس قدر مردہ ہو گیا کہ کسی کام کا خیال تک نہیں آتا تھا اور دماغ ایسا ماؤف ہو گیا تھا کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں اسی دورِ تفکّر اور درماندگی میں مشغلۂ دل کے لئے پھر ایک روز یکایک یہ خیال آیا اور ذہن نے پلٹا کھایا کہ تجلیات انجم کو طبع کرانا چاہیئے فوراً اٹھ بیٹھا اور مسودۂ تجلیات انجم کو ہاتھ میں اٹھا لیا

دل میں ایک تسکین سی محسوس ہوئی ۔ سوچنے لگا اب کیا قدم اٹھانا چاہیئے جیسا کلام ہے ویسی ہی شاندار طباعت ہونی چاہیئے ۔ مگر ہاں پہلے ضرورت ہے کہ اس کلام پر بہترین تبصرہ لکھوایا جائے چنانچہ اسی تلاش و جستجو میں سید طاہر حسین صاحب بیانوی سے ملاقات کی ۔ آپ نے میری بڑی ہمت افزائی کی ۔ آپ چونکہ کراچی کے سب سے بڑے اخبارات و رسائل کے ایجنٹ ہیں اور آپ کا کاروبار بہت وسیع پیمانہ پر ہے اس لئے بہت عدیم الفرصت ہیں باوجود بے حد ہمدردی رکھنے کے میری بدقسمتی کہ میرا یہ کام معرض التوا میں پڑتا رہا ۔ آپ نے مجھے چند نامور صحافیوں سے ملایا ۔ مگر میری حسب منشاء کام نہ ہو سکا ۔

بالآخر میں جناب ڈاکٹر سید منظور حسن صاحب جعفری شفا بھرتپوری کی خدمت میں پہنچا اور عرض مدعا کی ڈاکٹر صاحب موصوف میرے عزیز تو ضرور ہوتے ہیں مگر میں سمجھے ہوئے تھا کہ وہ اپنے مطب کی مشغولیت کی وجہ سے کہاں ایسی باتوں کی طرف التفات کریں گے البتہ یہ میں ضرور جانتا تھا کہ وہ طبیعت موزوں کے مالک

ضرور ہیں اور شفاؔ تخلص بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ میرے خیال کے برخلاف اور میری امید کی افزائش کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف نے بڑی خندہ پیشانی سے کلام انجمؔ پر تبصرہ لکھنا منظور فرما لیا اور میری بڑی ہمت افزائی بھی فرمائی۔ تبصرہ جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا ہے مجھے اس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے وہ خود بتادیگا کہ میں کیا چیز ہوں۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کے تبصرہ کے بعد کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی مگر چونکہ ادب اور ڈاکٹری میں بعدالمشرقین ہے اور ہر شخص یہ سمجھنے سے قاصر رہ سکتا ہے کہ ڈاکٹر بھی ادیب ہوسکتا ہے اس لئے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کسی مایہ ناز ادیب سے اس ادب پر ایک مختصر سا تبصرہ لکھنے کی باادب درخواست اور کی جائے نظر انتخاب سید محمد جعفری المتخلص بہ جعفریؔ پر پڑی آپ کی ذات گرامی سے کون واقف نہیں ہے سنجیدہ ادب کے مشہور ترین شعراء سے لوگ اس قدر آشنا نہیں ہوں گے جتنے ہمارے ماہر مزاحیہ ادیب جعفریؔ سے کہ پاکستان اور ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ آپ ایران میں بھی لوگوں کو اپنے مزاح کا دیوانہ بنا آئے ہیں اور کلام انجمؔ پر جو تبصرہ آپ نے فرمایا ہے بس یوں سمجھ لیجئے کہ دریائے زخّار کو کوزہ میں نہیں کوزیہ میں بند کر دیا ہے سچّے موتیوں کو ریشمی دھاگےمیں برابر برابر پرو کر چند لڑیاں بنادی ہیں اور کیوں نہ ہو آپ ادیب ابن ادیب ابن ادیب جو ہوئے۔ سید مرتضیٰ صاحب بیدار آپ کے دادا مرحوم علی اللہ مقامہٗ بہر میں بڑے پائے کے عالم گزرے ہیں اور آپ کے پردادا میاں جی کرامت علی ان قابل بزرگوں میں سے تھے جو فراموش نہیں ہو سکتے۔ آپ کی تین نظمیں

بڑی مشہور زمانہ رہی ہیں۔ بستر ما تکیہ اور کمبل۔ یہ شعر آپ ہی کا ہے:۔

تکیہ و بستر و کمبل دارم و جملہ سامان مکمل دارم

سید مرتضیٰ صاحب بیدار کی طبع رواں کا یہ حال تھا کہ صبح کے وقت ایک روز نواسی سوتی رہ گئی نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا اس کو آپ بیدار کرتے جاتے تھے اور فی البدیہہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔

مرحبا اے مرے بیدار نہ ہونیوالے صبح ہوتے ہی اٹھے جتنے تھے سونیوالے

الغرض یہ تو تھا وہ اثر جو انجم مرحوم کو خاندان سے وراثتاً پہنچا تھا لیکن اس کے ماوراء اور بالاتر اثر تھا وطن عزیز کی مٹی کا کہ جس کی مٹی سے دور ماضی ہمیشہ کاملین ہی پیش کرتا رہا تھا انجم مرحوم کا وطن آبائی مردم خیز قصبہ پہاسر تحصیل ندئی ریاست بھرتپور شرقی راجپوتانہ تھا تقسیم پاکستان اور ہند سے پہلے یہ وہ قصبۂ سادات تھا جو ریاست بھرتپور کے وجود میں آنے سے سینکڑوں برس پہلے سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے سادات عظام کے حسن کارکردگی کے عوض میں لبطور معافی ۱۰۲۱ء میں آباد ہوا تھا یہاں کے سادات عظام بڑے عالی مرتبت بڑے عالی حوصلہ اور بڑے عالی دماغ اور صاحبِ علم و فضل ہوتے آئے ہیں ریاست بھرتپور کے وجود میں آنے کے بعد چونکہ یہ قصبہ اس کے حدود کے اندر آگیا تھا اس لئے ریاست میں شمار ہونے لگا تھا ورنہ اپنا تشخص علیحدہ رکھتا تھا اور مہاراجگانِ ریاست سے برابری کا سلوک برتا جاتا تھا۔ حدود ریاست میں ہونے کی وجہ سے سالانہ نذرانہ کے طور پر کچھ رقم مہاراجہ کو دی جاتی تھی اور مہاراجہ کے یہاں سے بھی

اس کے عوض میں کچھ تحفہ آتا تھا اس صورت سے ریاست بھرتپور کے وجود میں آنے کے بعد بھی سادات پہرسر کی ریاست میں بڑی قدر و منزلت تھی یہی نہیں بلکہ برٹش انڈیا میں سادات پہرسر اپنی اعلیٰ دماغی اور اعلیٰ علمی قابلیتوں کی وجہ سے بڑے بڑے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں سید آلِ محمد صاحب مرحوم بیرسٹر پہرسر کی وہ مایہ ناز ہستی تھے جو یوپی میں پہلی ہندوستانی شخصیت کی حیثیت سے کلکٹری کے عہدے پر فائز رہے ورنہ ان سے پہلے ہمیشہ انگریز ہی کلکٹر ہوتے آئے تھے۔

سید ابو محمد صاحب وہ قابل قدر شخصیت تھے جو پبلک سروس کمیشن انڈیا میں رکن اعلیٰ کی حیثیت سے رہے۔ سیشن جج سب جج ڈپٹی کلکٹر تحصیل ڈی، آئی، جی پولیس، سپرنٹنڈنٹ پولیس، انسپکٹر پولیس، مجسٹریٹ، ڈپٹی مجسٹریٹ وغیرہ تو بہت سے پہرسر کے معزز بزرگان گزرے ہیں اور بڑے اعلیٰ اعلیٰ کارناموں اور بڑے قابلِ تعریف دورِ حیات کے لوگ گزرے ہیں۔ سرزمین پہرسر نے ہر شعبۂ حیات کے اعلیٰ ترین معیار کی شخصیتیں تمام وسعت ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بیرون ہندوستان بھی پھیلائیں سید محمد جعفر حسین صاحب پہرسری لندھنیا وہ قابل قدر ہستی تھے جو لندن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ریاست جے پور میں وزیر کے عہدے پر فائز رہے اور آپ کے منجھلے صاحبزادے سید محمود الحسن جعفری وہ قابل قدر شخصیت تھے جو لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بڑے اعلیٰ جرنلسٹ اور صحافی مشہور تھے۔ سید محمود الحسن صاحب جعفری سینٹرل انڈیا میں

اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور ڈائریکٹر لینڈ ریکارڈز گورنمنٹ آف انڈیا کے عہدے پر فائز رہے۔ سید آل رضا صاحب رضوی پہرسری مرحوم سی پی میں بڑے قابل سیشن جج کی حیثیت سے کارفرما رہے۔ سید علی متقی صاحب جعفری پہرسری نے بھی سی پی میں بڑی شان کے ساتھ عہدۂ ججی کو کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ اسی طرح سے سادات پہرسرا اپنی مختلف اعلیٰ دماغی خصوصیات کی بنا پر حیات کے تقریباً تمام مختلف شعبہ جات میں بام ارتقاء کی بلند ترین چوٹی پر ہی نظر آتے ہیں۔ شعبۂ شاعری میں بھی ایسے ایسے لوگ گزرے ہیں کہ جن کو اگر ثانیٔ انیس و داغ کہا جائے تو حقیقت سے دور نہیں ہوگا۔ سید شبیر حسین صاحب جعفری نسیم پہرسری مرحوم کی ذات گرامی حقیقتاً پہرسر کے لئے مرثیہ میں انیس اور غزل میں داغ ہی تھی۔ آپ ریاست بھرت پور کی پولیس میں انسپکٹری کے عہدے پر فائز تھے اور اپنے وقت کے بہترین انسپکٹر تھے باوجود اس تضاد کے اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے غزل میں حضرت فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگرد رشید تھے اور مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں میر خورشید علی نفیس کے شاگرد رشید تھے آپ بڑے قادر الکلام شاعر تھے اور بڑے طباع اور بڑے سنجیدہ مزاج کے مالک تھے آپ نے متعدد مرثیے اور ایک ضخیم دیوان غزلوں کا چھوڑا ہے جو مطبوع ہے بدقسمتی سے قیمتی سرمایہ مرثیوں کا طبع نہ ہو سکا اوائل عمر ہی سے نسیم صاحب پہرسری کی جودت طبع کا یہ حال تھا کہ حضرت داغ دہلوی سے غائبانہ خط و کتابت کے ذریعہ سے اصلاح لینی شروع کر دی تھی ایک مرتبہ داغ صاحب رامپور میں

تشریف رکھتے تھے شاگرد کی جودت طبع سے متاثر ہوکر دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ رام پور سے خط لکھا کہ مجھ سے آکر ملو۔ نسیم صاحب بہر سری تعمیل حکم میں استاد کی خدمت میں رامپور پہنچے۔ وہاں داغ صاحب کے یہاں دستور تھا کہ ہفتے کے ہفتے اہل کمال اساتذہ ایک مقام پر جمع ہو جاتے تھے اور ایک ادبی نشست ہوا کرتی تھی ہر شخص اپنا اپنا کلام سناتا تھا اور داد تحسین پاتا تھا۔ داغ صاحب اس صحبت میں اپنے شاگرد (نسیم بہر بہری) کو بھی ہمراہ لے گئے۔ حاضرین محفل سے تعارف کرایا اور بڑی تعریف کی۔ اس قدر تعریف کی کہ خواجہ اسد صاحب تلق سے نہ رہا گیا۔ نسیم صاحب سے فرمائش کر ہی دی کہ سید صاحب کچھ ہمیں بھی سنائیں بس پھر کیا تھا۔ سید صاحب تھے من چلے اور بے باک اور چڑھتی ہوئی جوانی کا زمانہ محکمہ پولیس کا دیسے ماحول دیکھے ہوئے تازہ تازہ ایک غزل نئے ردیف قافیہ میں استاد کے سنانے کے لئے لے گئے تھے اور ابھی استاد کو سنائی بھی نہ تھی فوراً جیب سے کاغذ نکالا اور بالکل استادانہ انداز میں وہ زنلّاٹے سے غزل سنائی کہ محفل دنگ رہ گئی اور تلق صاحب سے تو رہا ہی نہ گیا۔ پوچھ بیٹھے "میاں صاحبزادے غزل تمہیں نے کہی ہے کیا تم دو چار شعر اس زمین میں اور بھی کہہ سکتے ہو؟ نسیم صاحب نے سر تسلیم خم کر کے جواب دیا حاضر ہوں۔ کتنا مختصر اور پیارا جواب تھا دوات قلم اور کاغذ منگوایا گیا اور نسیم صاحب اسی کمرہ کے ایک گوشہ میں الگ ہو بیٹھے اور تھوڑی سی دیر میں سترہ شعر کی غزل طیار کر کے پیش کر دی۔ داغ صاحب نے فرط خوشی سے لپٹا لیا اور فرمایا۔ ہاں بیٹا پڑھو

غرض کہ غزل پڑھی گئی اور اب کی مرتبہ پورے جوش سے اور بڑی شان سے پڑھی گئی کیونکہ پہلی غزل سے یہ غزل بہت بلند تھی اس لئے حاضرین جلسہ غزل کو سن کر وجد کرنے لگے۔ تحسین و آفرین کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں ارباب ذوق مزے لینے لگے تھوڑی دیر میں وہ رنگ جما کہ مشاعرہ بزم حال وقال بن گیا۔ نوعمر شاعر کے استادانہ طرز میں بے ساختہ پن کے ساتھ استاد کے رد برد فخریہ انداز کے ساتھ غزل پڑھنے نے مخالفین کے دلوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا (یعنی وہ داد دینے اور تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے) خواجہ قلق نے بے اختیار تعریف کی۔ ہونہار نوجوان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ امیر مینائی نے اٹھ کر گلے لگایا۔ فصیح الملک نے فخر کے ساتھ پیشانی چومی۔ منشی منیر اور دیگر کاملین نے ترقیٔ علم وکمال اور خیر وبرکت کی دعائیں دیں اور بزم میں تادیر نسیم صاحب پر گفتگو رہی آپ کو بھی ضرور ان غزلوں کے سننے کا اشتیاق ہوگا اس لئے دونوں غزلیں پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

پہلی غزل

دل بیتاب کا آنا ہی تھا دشوار چٹکی میں
وگرنہ مثل گل متابت خونخوار چٹکی میں

نہیں کرتے انھیں کچھ دیر لگتی ہے نہ ہاں کرتے
ابھی انکار چٹکی میں ابھی اقرار چٹکی میں

چھٹوں اے ہمصفیر دنیجۂ صیاد سے کیونکر
دبے ہیں بال و پر مٹھی میں اور منقار چٹکی میں

ستاری ہے تمھاری یا کہ نغموں کا خزانہ ہے
بنی مضراب بھی منقار موسیقار چٹکی میں

نشان کفر ہے وہ پاک زاہد چھو نہیں سکتا
برنگ سبحہ رہتا ہے کہاں زنار چٹکی میں

تساہل اس کو لانے میں ہے کیا اے ہمنشیں تجھکو
کیا کرتے ہیں سارے کام سب ہشیار چٹکی میں

کبھی ذکر عدو پر میں جو بگڑا تو کہا اس نے
ہوئے جاتے ہو تم تو جان سے بیزار چٹکی میں

کہاں ہے خون چشم ناتواں میں اس کو سودا ہے
یہ کیوں نشتر لیا صیاد نے بیکار چٹکی میں

ملے گر خاک در تیری تو ہے اکسیر کی چٹکی
ابھی ہوتا ہے اچھا یہ دل بیمار چٹکی میں

نسیم اب دیکھئے ہوتا ہے کس کا مرغ دل بسمل
کماں ہے دوش پر صیاد کے سوفار چٹکی میں

دوسری غزل فی البدیہہ یہ ہے جس نے استادوں کی محفل مشاعرہ کا رنگ دگرگوں کر دیا

غزل

دکھائے معجزے گر وہ بت عیار چٹکی میں
تو بولے طائر رنگ حنا ہر بار چٹکی میں

حنائی تند تیر ہیں سرخ ہے سوفار چٹکی میں
کھلایا ہے مرے قاتل نے کیا گلزار چٹکی میں

جو ہوتے نیل بوسوں کے تو مٹ جاتے مٹانے سے
ملے ہیں غیر نے تیرے گل رخسار چٹکی میں

رگ گل کو وہ سمجھے خار یہ طرفہ نزاکت ہے
ملے جس نے ہزاروں دل ہزاروں بار چٹکی میں

پڑے بازو پہ فرط نازکی سے نیلگوں دھبے
جو پکڑی خواب میں بھی آستین یار چٹکی میں

ہمارے دل کے ہاتھوں بادشاہت عشق کرتا ہے
یہ دولت اس کی مٹھی میں ہے یہ سرکار چٹکی میں

ہمارے زخم دامن دار میں ہو نیلگوں کاوش
الٰہی کس نے پکڑا دامن دلدار چٹکی میں

خلش تیری مرے تلووں کے گویا بوسے لیتی ہے
مزا ایسا کہاں لے وادیٔ پرخار چٹکی میں

حقیقت کبک و طاؤس گلستاں کی بھلا کیا ہے
قیامت کو اڑاتی ہے تری رفتار چٹکی میں

جہاں چٹکی بجائی یار نے دل نے کہا حاضر
کہاں سے آگئی جادو بھری گفتار چٹکی میں

جھجکتا ہے دم بادہ کشی اللہ رے شرم اسکی
الگ لیتا ہے زاہد ساغر سرشار چٹکی میں

نہیں کیا زہر بار زیف میں جو تم دباتے ہو ۔۔۔ ہزاروں بار دانتوں میں ہزاروں بار چکی میں

لیا تھا اس زمیں میں امتحاں طبع یاروں نے
کئے ہم نے یہ موزوں اے نسیمؔ اشعار چکی میں

غزلیں آپ نے ملاحظہ فرمائیں، اب سماعت فرمائیے۔ حضرت نسیم صاحب بھرسری مرحوم خود بڑے کردار کے انسان تھے، فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کی وفات کے بعد احقرؔ، وجاہت، افسوں شاگردان حضرت داغؔ نے آپ کو جانشینی کے لئے بہت مجبور کیا اخبارات میں بھی یہ مسئلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ لیکن آپ نے سب کو یہی جواب دیا کہ شاعری کوئی خانقاہ یا درگاہ نہیں ہے جس کا سجادہ نشین کسی کو بنایا جائے آپ کا اعلیٰ کردار اور ارتقار روحانیت آپ کی ایک مشہور غزل کے ایک مقبول عام مقطع سے بھی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

صبح چلنا کوئے جاناں میں نسیمؔ ۔۔۔ اب یہ کیا موقع ہے آدھی رات ہے

(اس مقطع میں جو شاعرانہ بلند معیاری ہے اور جو لطیف ادبیت ہے وہ تو پڑھتے ہی دل کو تڑپا دیتی ہے اور سبحان اللہ کا نعرہ بے ساختہ منہ سے نکلوا دیتی ہے)

اللہ رے بلاغت کلام نسیمؔ بھرسری۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی غزل کی طرح مرثیہ گوئی میں بھی نسیمؔ بھرسری صاحب کو کمال حاصل تھا ایک مرتبہ آپ اپنا تصنیف مرثیہ لے کر میر ببر علی انیسؔ کی خدمت میں لکھنؤ تشریف لے گئے اور مرثیہ بغرض اصلاح انیسؔ صاحب کو پیش کیا۔ میر انیسؔ نے مرثیہ ملاحظہ فرمانے کے بعد صرف اتنا کہا کہ میر صاحب آپ نے بھرسر کی زبان لکھی ہے۔ باقی مرثیہ میں ایک نقطہ تک نہیں لگایا۔

بندش الفاظ اور شان و شوکتِ لفظی کے لحاظ سے نسیم صاحب کا کلام آسمانی رفعت پر پہنچا ہوا تھا۔ نمونہ کے طور پر ان کے مرثیہ کے دو تین بند پیش کرتا ہوں ؎

طرۂ تاجِ فصاحت ہے لطافت میری		شاہدِ نظم کا زیور ہے طلاقت میری
غازۂ عارضِ معنی ہے بلاغت میری		بحرِ مواجِ مضامیں ہے طبیعت میری
رنگ فق دبدبۂ نظم سے حساد کا ہے
شور عالم میں مری طبع خداداد کا ہے

جو ہے مقبولِ خلائق وہ سخن میرا ہے		نکتہ داں جس کے ہیں شائق وہ سخن میرا ہے
جان دیتے ہیں منافق وہ سخن میرا ہے		جس پہ تاثیر ہے عاشق وہ سخن میرا ہے
خلق میں ہو تو زباں کے لئے کام ایسا ہو
طبع رنگین ہو جو ایسی تو کلام ایسا ہو

ہوش میں لائے جو مجنوں کو وہ عاقل میں ہوں		تیغ سرکوب پئے سرکش و جاہل میں ہوں
فاضلوں پر ہیں عیاں جس کے فضائل میں ہوں		ناقصوں کو جو بنا دیتا ہے کامل میں ہوں
قدرداں منزلت و قدر مری جانتے ہیں
جو کہ عارف ہیں وہ رتبہ مرا پہچانتے ہیں

ہاں کوئی غیر مرا رنگ اڑائے تو سہی		سامنے صاحبِ فضل و ہنر آئے تو سہی
جوہرِ تیغِ سخن ہم کو دکھلائے تو سہی		یہ خداداد اثر نظم میں لائے تو سہی
لطف کیا ہے جو طبیعت ہی فقط عالی ہو
جب سند ہے کہ زباں صاف ہو ٹکسالی ہو

چونکہ نسیم صاحب کے مراثی بدقسمتی سے نہ ان کی حیات میں زیورِ طبع سے آراستہ

ہو سکے نہ ان کے پسماندگان کو خدا نے اتنی توفیق عطا فرمائی کہ وہ اپنے وطن مایہ ناز بزرگ کے نام کو قائم اور روشن رکھنے کے لئے ان کے مراثی کو چھپوا دیتے اس لئے اب تک نسیم بہرسری کا کلام سرقہ ہوتا رہا ہے اور ان کی حیات میں بھی ہوا جس کی طرف اشارہ ان کے کلام میں ملتا ہے اور ان کی وفات کے بعد بھی ہوا۔

علاوہ مراثی کے نسیم بہرسری نے متعدد اور بڑے پیارے پیارے سلام بھی چھوڑے ہیں جو قلمی صورت میں مختلف صاحبان کے پاس رہے۔ ہمارے یہاں بہرسر بھرپور اور گرد و نواح میں سوزخوانی کی کوئی ایسی مجلس نہیں ہوتی تھی جس میں نسیم صاحب کا سلام نہ پڑھا جاتا ہو اور مجلس گرما نہ جاتی ہو۔ خدا بھلا کرے بانیان انجمن ذوالفقار حیدری حسین آباد گولیمار کراچی کا کہ انھوں نے اپنی سالانہ اشاعت مجموعہ سلام و مرثیہ و نوحہ جات "تصویر درد" بابت ۱۳۷۸ھ کے صفحہ ۱۳۷ پر نسیم صاحب بہرسری کے ایک بہت مشہور اور زبان زد خلائق سلام کے سات اشعار جو ان کو مہیا ہو سکے چھاپ دیئے ہیں۔ خدا ان کو جزائے خیر دے۔ آپ کی لطف اندوزی کے لئے وہ اشعار پیش کرتا ہوں۔

سلام

دل میں جس مومن کے حب ساقیٔ کوثر نہیں
پھول ہے خوشبو نہیں آئینہ ہے جوہر نہیں

چشم گریاں گر نہیں بزم عزائے شاہ میں
باغ ہے چشمہ نہیں فردوس ہے کوثر نہیں

نظم رنگیں میں نہیں اکبر کا گر ذکر شباب
باغ ہے سبزہ نہیں محبوب ہے زیور نہیں

دخترانِ فاطمہ کیونکر چھپائیں اپنے سر
شرم ہے مقنع نہیں بازار ہے چادر نہیں

دیکھ کر اژدر کو ششدر کیوں نہ ہو جائیں کلیم — پیر ہے مرشد نہیں موسیٰ ہے وہ حیدر نہیں
بیکس و تنہا کھڑے ہیں دشت میں سبطِ رسول — چاند ہے تارے نہیں سردار ہے لشکر نہیں
بزم میں مداحِ حیدر گر نہیں ہے اے نسیمؔ
طور ہے جلوہ نہیں دن ہے شہِ خاور نہیں

نوٹ:۔ تصویر درد میں نسیم صاحب کا نام غلطی سے غالباً شبّر حسین کے بجائے شبیّر حسین چھپ گیا ہے۔ صحیح نام سیّد شبّر حسین جعفری نسیم بہرسری تھا۔

بہرسر کا یہ ادبی دور بہت زمانہ سے شروع ہوتا ہے بزرگوں سید کرامت علی صاحب بڑے پایہ کے عالم گزرے ہیں ان کے ورثہ میں تین معرکتہ الآرا نظمیں ، بستر، تکیہ اور کمبل ان کے پڑپوتے سید محمد جعفری پاکستان کے مایہ ناز مزاح گو شاعر کے پاس اب تک محفوظ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

وہ سرگشتہ ہے جس کو ہے کسی سردار کا تکیہ — وہ درماندہ ہے جس کو ہے کسی دربار کا تکیہ
بڑے در کے گدا ہیں ہم بڑی سرکار کا تکیہ — نظر کو عینک شمس و قمر دیدار کا تکیہ
مرے ہادی کو تھا اک مہر کا ایک ماہ کا تکیہ

معین الدین، نظام الدین و مسعود و سلیم اعظم — ولی مشہور ہیں جاتا ہے میلہ کے لئے عالم
مگر سینہ میں یاں وہ حال دل کی بھی نہیں کچھ کم — خداوندا صدائے دم مدار آتی ہے چلتے دم
فقط اس میدنی کو ہے تری درگاہ کا تکیہ

یہ ایک بہت طویل مخمس ہے جس میں چار حصوں کو بطور چار تکیوں کے جگہ دی ہے پھر ایک مسدس اسی بحر میں بستر کے عنوان سے لکھا ہے آخر میں یہ شعر درج ہے

جملہ سامان مکمل دارم — تکیہ و بستر و کمبل دارم

بہر حال یہ وہ دو گہرے اثرات یعنی ایک وطنی اور دوسرا خاندانی ہے جن کے زیر اثر ذہن و دماغ انجم کی پرورش اور ارتقار ہوئی تھی جس کے ابتدائی جوہر اس کے اس مختصر کلام سے درِ شہوار کی طرح چمک رہے ہیں جو جناب کی فکر و نظر کے واسطے پیش کر رہا ہوں۔ فقط

سیّد امیر حسن جعفری المتخلص بہ اختر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تبصرہ

پروردگار عالم کی قدرت کاملہ اور صناعیٔ اعلیٰ پر انسان جتنا بھی غور کرے اس کا تحیّر اور استعجاب بڑھتا ہی چلا جائے گا اور ہر قدم پر اپنی بے مائیگی اور تحقیر کے بڑھتے ہوئے احساس سے اس کا زعم خودی اور خودپسندی گھٹتا ہی چلا جائے گا ترکیب اور تشکیل کائنات کی نیرنگیوں اور پیچیدگیوں کی سائنس کے ہاتھوں موشگافیوں نے دماغِ انسان کو اب اتنا متاثر اور مبہوت بنا دیا ہے کہ اب وہ اپنے تصور میں بھی یہ نہیں لا سکتا کہ یہ کارخانۂ عظیم بغیر کسی قوتِ فاعلہ کے بھی چل سکتا ہے اور بغیر کسی طاقت محافظ کے قائم و برقرار بھی رہ سکتا ہے اس لئے کہ ہر ذرہ میں ایک علیحدہ تصویر ہے اور ہر نقطہ میں ایک الگ تفسیر ہے۔ ہر نقش میں ایک نئی صورت نظر آتی ہے تو ہر صورت میں ایک نیا جلوہ دکھائی دیتا ہے ہر جسم میں ایک نئی تشکیل ہے تو ہر دماغ میں ایک نئی تکمیل ہے۔ ہر نفس میں اگر جداگانہ قوتیں ہیں تو ہر روح میں منفردانہ ارتقائی منزلیں ہیں اور یہ سب نیرنگیاں اور یہ سب پیچیدگیاں، یہ سب صناعیاں اور یہ سب کاریگریاں یہ ہی پتہ دیتی ہیں کہ جس صناع نے ان صنعتوں کو منفردانہ اور یگانہ حیرت انگیز اور معجزانہ بنایا ہے وہ اپنی ہستی میں بھی خود منفرد اور یکہ و تنہا ہی ہو سکتا ہے اور ہے اور قادر بھی ایسا کہ جو چاہے بنا دے اور جو چاہے مٹا دے۔ اگر چاہے تو جتنی انواع اب کائناتِ عالم میں وجود میں ہیں اتنی ہی اور موجود کر دے

اور وہ بھی سب ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد اپنی نوعیت میں یگانہ اور اپنی ہیئت میں جداگانہ۔

غرض کہ اس کرشمہ ساز قدرت کو نوع بنوع کرشمہ ہائے صناعی کا دکھانا اور گونہ گوں ارتقائی شاہکاروں کا پیدا کرنا ایک سہل ترین اور آسان ترین چیز ہے جہاں چاہے جو پیدا کردے اور جسے چاہے جو عطا کردے جسمانی حیثیت سے کسی کو رستمِ زماں بنادے تو نفسانی حیثیت سے کسی کو فرشتوں سے بھی آگے بڑھادے کسی کے جسم میں بجلی کی تڑپ بھردے تو کسی کے ذہن کو حیرت انگیز تنوع عطا کردے کسی کے اعضائے بدن کو ان کے فرائض کی اعلیٰ ترین ادائیگی ودیعت کردے تو کسی کے قوائے دماغ کو بام ارتقار پر پہنچادے۔

قدرت کاملہ خلّاق عالم کی یہ سب کارفرمائیاں اور یہ سب سرفرازیاں روزِ روشن کی طرح جلوہ آرا ہیں اور ہر روز انسانی جسم کی چستیاں اور چالاکیاں اور اس کے مظاہرات قوت وطاقت ہر نظر کے سامنے آکر محو حیرت کرتے ہیں اور عقل وبصیرت انسان کو دعوت فکر وعمل دیتے رہتے ہیں ظاہری آنکھوں کو خیرہ کرکے دیدۂ دل کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔

مگر یہ فریب خوردہ انسان یہ ہی سمجھتا رہتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی خودکی ذاتی اور کبی کوششوں کا نتیجہ ہے لیکن نظر غائر سے اور بصیرت دافر سے دیکھنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ رستمِ زماں صرف ایک ہی ہوا ہے اور بھولو پہلوان اور محمد علی کلے واحد واحد شخصیتیں ہیں حالانکہ ہر شعبۂ حیات میں جان توڑ کوشش کرنے والے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں نظر آتے ہیں اسی طرح سے شیکسپیئر اور انیس دوبارہ پیدا نہیں ہوئے ایسا

کیوں ہے صرف اس وجہ سے کہ ع

جو جس کے حق میں سمجھا وہ بہتر بنا دیا

کمزور کوئی، کوئی قوی تر بنا دیا

تو معلوم ہوا کہ بنانے والا بناتا ہے۔ بننے والا تو صرف بنتا ہے اب یہ بنانے والے پر ہے کہ کیسا بنائے اور کیسا نہ بنائے۔ جیسا بنائے گا بننے والا ویسا ہی بنے گا مگر اس بنانے اور بننے کے کیا معنی ہیں۔ صرف یہ ہی کہ ہر فعل کے لئے ایک لازمہ اور ہر حرکت کے لئے ایک آلہ مہیا کرتا ہے اس لئے کہ بغیر لازمہ کے فعل نہیں اور بغیر آلہ کے حرکت نہیں۔ اور دوسرے الفاظ میں یوں کہوں کہ بغیر جسم کے اظہارِ فعل نہیں اور بغیر متحرک کے اظہار حرکت نہیں۔ جسم یعنی آلہ فعل اور فعل یعنی صلاحیت آلہ یعنی اظہار قوت و قدرت جسم۔ جسم وہ جو حواس خمسۂ ظاہری سے درک ہو اور قوتِ جسم وہ جو حواس خمسۂ باطنی سے درک ہو۔ جسم مُجسّم مادہ کا نام ہے اور قوت جسم ایک متشکل اور منضبط طاقت کا نام ہے جو مختلف افعال کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور چونکہ یہ مختلف افعال اپنے صدور کے لئے متقاضی تھے مختلف اور مناسب آلات یعنی اعضائے جسم کے اس لئے جس کو تیز دوڑنا مقصود تھا اس کو وہ آلات اور وہ اعضاء دیئے گئے۔ جن سے تیز رفتاری سرزد ہو۔ جن کو بروئے ہوا پرواز کرنا مقصود تھا ان کو وہ آلات اور اعضاء عطا ہوئے جن سے تیز پروازی پیدا ہو۔ جن کو پانی میں رکھنا پسند خاطر تھا۔ ان کو وہ لوازمات بخشے گئے جن سے سبکی جسم اور تیرنے کی صلاحیت رونما ہو۔ جن سے دوسروں کو زیر کرانا چاہا گیا۔ ان کو قوتِ جسمانی مرحمت کی گئی اور جن سے نورِ علم پھیلوانا منظور تھا ان کو اس دماغ سے سرفراز فرمایا گیا جس سے علم کے وہ چشمے ابھرے کہ تمام تشنگان

علم سیراب ہو گئے۔

مذکورہ بالا تشریح سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہر کارے اور ہر مرد ے نہیں بلکہ ہر عضوے اور ہر فعلے۔ نظر تدبر اور تجربے سے یہ حقیقت آشکارہ ہو جاتی ہے کہ انسانی اعضائے جسم میں عضو دماغ ہی انسان کا وہ آلہ ہے کہ جس سے یہ بام ارتقار تک پہنچ سکتا ہے اور پہنچا ہے انسانی دماغ کی ساخت اور اس ساخت کی وہ ہیئت مخصوص جس کو قدرت خود اپنی منشار کے مطابق متشکل کرتی ہے وہ میکانکی ترکیب اور اس کے اجزائے اندرونی یعنی مراکز کی وہ ترتیب اور پیوستگی ہے جس سے انسان کی انسانیت رونما ہوتی ہے اس کے جوہر نہاں ظاہر ہوتے ہیں اور اس سے معجزاتی افعال تک رونما ہونے لگتے ہیں

جس طرح سے دو جسم آپس میں ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ اسی طرح سے دو دماغ بھی ایک جیسے نہیں کسی کی ترکیب و ساخت دماغی ایسی ہوتی ہے کہ جس سے صرف معمولی تعقل پیدا ہو سکتا ہے اور کسی کے دماغ میں وہ اجزائے ترکیبی اور وہ صورت ترکیبی ودیعت ہوتی ہے جس سے وہ شاہکار عقلی ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں جن کو دیکھ کر معمولی عقلیں غرق حیرت و استعجاب ہو کر رہ جاتی ہیں کوئی دماغ اگر علم منطق میں طاق ہوتا ہے تو کوئی علم فلسفہ میں شہرۂ آفاق ہوتا ہے کسی کا دماغ اگر تحریر نثر میں برق رفتار ہے تو کسی کا تخلیق نظم میں جوہر بار ہے۔ انگریزی ادب اگر شیکسپیر کو ملک الشعراء مانتا ہے تو اردو ادب انیس کو نظم کا خدا جانتا ہے اور یہ دونوں وہ دماغی دیو پیکر تھے جن کے دماغوں کی ساخت کو قدرت نے کچھ اس صورت سے ترتیب دے دیا تھا کہ جن میں سے نظم کے شاہکار ایک سے ایک بہتر ڈھلتے اور نکلتے چلے جاتے تھے۔

مگر قدرت کے دست فیاض کو تاہ نہیں ہے وہ اگر چاہے تو کسی بچے کے دماغ کو

انیسی عنوان پر ڈھال دے اور اگر چاہے تو کسی نوخیز طفل کے دماغ کو جوش جیسے کہن سالہ استاد اور قادر الکلام شاعر کا اسلوب عطا فرما دے اور قدرت نے ایسا کیا بھی ہے چنانچہ ایک بائیس سالہ جواں مرگ شاعر کے خداداد دماغ کی تخلیقات ملاحظہ فرمائیے ایک جنازہ کو دیکھ کر نظم کہتا ہے ۔ مطلع ہے ۔

جا رہا تھا اک طرف میں دل شکستہ وقتِ شام
مقصدِ نیرنگیٔ قدرت کا کرتا احترام

یہ شعر اگر کسی کہن سالہ مشاق شاعر کی استادانہ جدت طبع کی تخلیق ہوتا تو چنداں تعجب کی بات نہ ہوتی لیکن ایک بائیس سالہ لڑکا جو صرف ابھی تھرڈ ائیر کا طالب علم ہی تھا اپنی عمر کے سترہویں یا اٹھارہویں سال ہی میں کہہ رہا ہے ۔ "مقصد نیرنگیٔ قدرت کا کرتا احترام" مصرعہ کے ہر لفظ پر اگر غور کیا جائے تو تخیل کی گہرائی وہاں پہنچتی نظر آتی ہے جہاں اچھے اچھے شعراء بہت اُتھلے پانی میں نظر آنے لگیں گے ۔ شاعر نے "مقصد نیرنگیٔ قدرت" ان تین لفظوں کو ایک مربوط لڑی میں پرو کر فلسفہ عبدیت اور معبودیت کے دریا کو گویا کوزہ میں بند کر دیا ہے ۔

"مقصد نیرنگیٔ قدرت الہ العالمین کی اس ماورائے عقلِ انسانی قوت خلاقیت کا اظہار ہے اور اعتراف ہے جو ان الفاظ سے بہتر اس رنگ تصوف و تغزل میں ادا نہیں کیا جا سکتا تھا اگر کہیں اپنی روانیٔ طبع میں وہ مقصد نیرنگیٔ فطرت کہہ گیا ہوتا جو محاورہ زبان کے مطابق زیادہ موزوں اور زیادہ مستعمل معلوم ہوتا ہے تو تخیل کی وہ بلندی اور وہ گہرائی بہت گر گئی ہوتی جس کو لفظ قدرت اپنے اندر لئے ہوئے ہے فطرت اور قدرت میں بڑا فرق ہے فطرت وہ میکانکی ترکیب یا ہیئت ہے جو اللہ العالمین نے ہر جنس ہر نوع ہر فرد بلکہ ہر ذرہ کو علیحدہ علیحدہ

اس کی ضروریات نعلی کے مطابق ودیعت فرمائی ہے اور قدرت ڈطاقت، وہ فورس وہ انرجی اور وہ نور ہے جو کائنات کی اِن مختلف فطرتوں کی تکمیل کرتا رہتا ہے اور جس کی منشار کے ماتحت جملہ نیرنگیاں عالم ظہور میں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں اور جس کے حضور ہی میں صرف سرِ تسلیم خم کیا جا سکتا ہے اور اسی لئے شاعر نے آگے لفظ احترام استعمال کیا ہے۔ اس لفظ احترام نے یہاں آکر گویا اس کی پیشانی کو اس کے حضور میں جھکا ہی دیا ہے

عنوان جنازہ کو دھیان میں رکھتے ہوئے پہلے مصرعہ پر اگر غور کیا جائے تو شاعر کے احساس فطری کی داد نہیں دی جا سکتی۔ جنازہ کی نظم کے مطلع کے پہلے مصرعہ میں لفظ شام کا آنا اور شاعر کا دل شکستہ ہو کر ایک طرف کو جانا گویا وہ جنازے کو دیکھ کر کہہ رہا ہے کہ اے مرنے والے تُو تو اپنے گہوارہ میں لوگوں کے کاندھوں پر آرام سے جا رہا ہے لیکن میں خود اپنے اس زندہ لاشہ کو کشاں کشاں اپنی عمر کی شام تک لے جا رہا ہوں میرے نزدیک یہ مصرع نہیں ہے بلکہ شاعر نے قبل از وقت اپنی موت کی پیشین گوئی کی ہے اور جنازہ کو دیکھ کر گویا ـــ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ رضاً بِقضائہٖ تسلیماً لِاَمْرِہٖ کہا ہے۔

نظم کا تیسرا شعر ہے:۔

دیکھ کر یہ درد کا خاموش منظر بے نقاب

کائناتِ زیست سے آنے لگا مجھ کو حجاب

یہ شعر ایک نوجوان شاعر کے کہن سالہ دل کی ترجمانی کر رہا ہے" درد کا خاموشی منظر" وہ جذبات اور حقیقت سے بھرے ہوئے الفاظ ہیں جو دل کی گہرائیوں میں اتر کر اور آہ بن کر نکلنا چاہتے ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ شاعر نے جنازہ کو درد کا

کا منظر کہا ہے رنج کا یا غم کا منظر نہیں کہا ہے نفسیات سے ذوق رکھنے والے ہی کچھ اس ترکیب الفاظ کا لطف اٹھا سکیں گے ظاہر ہے کہ رنج ایک احساس دماغی یا نفسی ہے جس میں جسمانی تکلیف کی آمیزش نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے درد میں تکلیف اور رنج دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں رنج زیادہ تر روح کو مضمحل کرتا ہے اور درد جسم و روح دونوں کو مضمحل کرتا ہے۔ رنج میں انسان روتا ہے لیکن درد میں تڑپتا بھی ہے اور روتا بھی ہے اور سب سے زیادہ سوہان جسم و روح وہ درد ہوتا ہے جو دل میں ہوتا ہے گویا جنازہ کو دیکھ کر شاعر کو رنج نہیں ہوا بلکہ درد ہوا اور درد بھی دل میں ہوا۔ اللہ رے حساس دل۔ اور غالباً اسی احساس قلب کی وجہ سے اس نے درد کہا ہے۔ رنج نہیں کہا۔

اور پھر منظر کو خاموش کہہ کر گویا واقعہ کی پوری تصویر کشی کردی ہے ذرا اس تصویر کو ذہن سے آنکھوں کے سامنے تو لایئے۔ آگے آگے کاندھوں پر جنازہ پیچھے پیچھے سوگوار گردن جھکائے خاموش آہستہ آہستہ چلے آرہے ہیں ایک سکوت مجسم ہے یا درد و غم کی جیتی جاگتی تصویر ہے جو سطح زمین پر آہستہ قدم بڑھاتی چلی جارہی ہے دل ہی دل میں ہر شخص کہتا چلا جارہا ہے۔ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ رضًا بِقَضَائِہٖ وَتَسْلِیْمًا لِاَمْرِہٖ۔ راستہ میں پیروں کی سرسراہٹ کے سوا سارا ماحول خاموش ہے اور یہ مجسم خاموشی ہے کہ اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتی چلی جارہی ہے اور پھر اس پورے منظر کی تصویر کو بے نقاب کہہ کر تو گویا اسے چوکھٹے اور شیشہ میں جڑ کر آنکھوں کے سامنے ہی پیش کردیا ہے اور انسان کی انسانیت کو گویا متوجہ کیا ہے کہ اس زندگانی دنیا کا آخری نتیجہ دیکھ لے جو کہ تیرے سامنے بالکل ایک کھلا ہوا منظر ہے۔

اس شعر کا دوسرا مصرع تو ایسا ہے کہ بار بار پڑھا جانے کے بعد بھی سیری نہیں ہوتی اور پھر پڑھنے کو دل چاہتا ہے کائنات زیست سے حجاب کہہ کر اور خصوصاً اس موقع پر لفظ حجاب کو استعمال کر کے تخیل کی گہرائی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے جنازہ کے اس منظر نے شاعر کے حساس دل و دماغ پر دہ معنی خیز اور گہرا اثر کیا ہے کہ وہ اب اس زندگانی دنیا سے جس کا کل ماحصل اب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک مطلق مجبوری اور بے مائیگی کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ خود شرم محسوس کرنے لگا ہے دنیوی زندگانی کی تحقیر کو کس پیارے انداز میں ادا کیا ہے کہ دل بے ساختہ کہنے کو تیار ہے کہ سچ کہا اور خوب کہا ہے۔

غرض اس نظم کے بائیس شعر اسی گہرے اور مسلسل فلسفۂ زندگانی دنیا کی تصویر کشی کر رہے ہیں۔ جس کو بڑے بڑے علماء اور واعظین صفحوں میں تحریر فرماتے ہیں اور گھنٹوں کی تقریر میں وضاحت کرتے ہیں لیکن نظم میں اور اتنی جامع نظم میں میری کوتاہ نظر سے یہ فلسفۂ حیات ابھی تک نہیں گزرا۔

آخر میں مقطع کے طور پر جو شعر کہا ہے اگرچہ انکساریٔ نفس کی بناء پر شاعر نے اس میں اپنا تخلص بیان نہیں کیا ہے۔ مگر شعر اپنے مقام پر خود کہہ رہا ہے کہ میں مقطع کا ہی شعر ہوں۔ کہتا ہے ؎

راحتیں سرمستیاں کیفِ بقا رکچھ بھی نہیں
زیست اک رنگین دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں

کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ یہ شعر ایک بیس اکیس برس کے لڑکے صرف ایف اے کلاس کے طالب علم کے دماغ کی تخلیق ہے اس کے الفاظ، الفاظ کی نشست طرزِ بیاں روانی اور پھر تخیئل کی گہرائی اور صداقت صاف باور کرا رہی ہے کہ کسی عمر رسیدہ زمانہ کے نشیب فراز

دیدہ زندگی کی سختیاں اور مصیبتیں اٹھائے ہوئے عالم باعمل متقی واعظ استاد الشعراء نے قرآن حکیم کی اس آیت کا ترجمہ اور جامع تفسیر کر دی ہے جس میں حیاتِ دُنیوی کی بے ثباتی اور تحقیر بیان فرمائی گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ واعظ اور مقرر کی واعظانہ تقریر اس عنوان پر سامعین کے کانوں پر ایک بارِ گراں ہو کر گزر جائے گی اور اس شعر کے رنگین دھو کے الفاظ دل کی گہرائیوں میں اتر کر رہ جائیں گے۔

غرض اس نظم کا تنوع اس مرحوم بائیس سالہ شاعر کے دماغی اور نفسی تنوع کی مثل آئینہ کے عکس فشانی کر رہا ہے اور یہ بتا رہا ہے کہ کس قدر بلند پرواز تخئیل تھا اور اور کس قدر موزونی طبیعت تھی کہ جس کو منشاءِ پروردگارِ عالم نے اپنی دوسری دنیا کی محفلِ مشاعرے کے لئے پسند فرما کر طلب کر لیا اور بہت جلد ہم سے پردہ کرا دیا۔

شاعر مرحوم کی جودتِ طبع کا صرف یہی ایک شاہکار نہیں ہے بلکہ اس کے ترکہ شاعری میں سے جو کچھ اس کا کلام اس کے باپ کو مل سکا ہے اس میں بہت سے آبدار موتی نظر آتے ہیں اور ایسے پیارے پیارے عنوانات پر نظمیں لکھی ہیں کہ جن کے عنوانات ہی کو دیکھ کر بلندیٔ تخئیل   دینے لگتا ہے۔ مثلاً دعوتِ سحر، فکرِ لطیف، حسین انقلاب وغیرہ وغیرہ اور ان نظموں کے علاوہ متعدد غزلیں بھی مرحوم نے چھوڑی ہیں جن کے طرزِ تغزل سے پڑھنے والے پر ایک وجد طاری ہوتا ہوا معلوم دیتا ہے اور جو شاعر کی اس کم عمری میں فلسفۂ حسن و عشق کے گہرے مطالعہ کی آئینہ دار ہیں۔

جس شاعر کی طبیعت کا لڑکپن اور عنفوانِ جوانی میں یہ حال ہے تو خیال کہتا ہے کہ ابتدائے عمر ہی سے اس کا کچھ غیر معمولی سا حال ضرور رہا ہوگا اس لئے دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے اس شاعر کی ابتدائے زندگی میں کیا کیفیت تھی اس کا بچپنا کیسا تھا اور ابتدائی

تعلیم میں اس کی کیا حالت رہی ہے لہٰذا کچھ مختصر سوانح حیات اس کے اس مقام پر قلمبند کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ اس کی شاعری کے اس اٹھان کو اچھی طرح سے ذہن نشین کیا جا سکے۔

مرحوم کا نام سید علی سجاد جعفری تھا بابو سید امیر حسن جعفری اختر پوسٹ ماسٹر کے منجھلے صاحبزادے تھے اس لئے عرف میں منجھو کہلاتے تھے۔ دسمبر ۱۹۲۳ء میں بمقام شاہ گنج آگرہ پیدا ہوئے اور ۲۵ر مئی ۱۹۴۵ء کو بمطابقت ۱۲ر جمادی الثانی ۱۳۶۴ھ بمقام بھرتپور انتقال کیا۔ جمعہ کا دن تھا اور صرف بائیس سال کی عمر ہونے کو آئی تھی گندمی رنگ چھریرہ بدن اور قد کچھ لمبا تھا سر بڑا، بال گھونگھر والے اور آنکھیں بڑی بڑی اور تجسسانہ نظر والی تھیں مرحوم کا وطن آبائی قصبہ دارالمومنین عرف پچھرسر ریاست بھرتپور تھا۔ ابتدائی تعلیم بیانہ ریاست بھرت پور کے ورناکیولر مڈل اسکول سے شروع ہوئی یوں تو اس دورِ تعلیم میں مرحوم کا کردار قابلِ صد ستائش رہا۔ لیکن ایک واقعہ اس کی جودتِ طبع کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

بیانہ کے ورناکیولر مڈل اسکول میں پہلا دوسرا اور تیسرا درجہ اوّل اور دوسرے آتے ہوئے جب مرحوم چوتھے درجے کا سالانہ امتحان دے رہے تھے اور انسپکٹر آف اسکولس خود ممتحن تھے تو مرحوم کے ہر مضمون کے پرچے پر انسپکٹر صاحب کو احساس ہوتا گیا کہ یہ لڑکا غیر معمولی ذہانت رکھتا ہے چنانچہ جغرافیہ کا پرچہ جس وقت سامنے آیا تو انسپکٹر صاحب سے نہ رہا گیا۔ ہیڈ ماسٹر اور کلاس ٹیچر سے دریافت کیا کہ یہ لڑکا کون ہے۔ بتایا گیا کہ پوسٹ ماسٹر بیانہ کا لڑکا ہے۔ کہا۔ بہت ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔ کلاس ٹیچر نے کہا کہ جغرافیہ میں (ایک ہندو لڑکے کا نام لے کر) وہ لڑکا بہت تیز ہے

اور ہمیشہ فرسٹ آتا رہتا ہے۔ انسپکٹر صاحب نے اس ہندو لڑکے کا پرچہ نکالا اور دونوں لڑکوں کو اپنے سامنے بلوایا۔ ہندو لڑکے سے سوال کیا۔ جزیرہ کسے کہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ جزیرہ اس کو کہتے ہیں جس کے چاروں طرف پانی ہو۔ انسپکٹر صاحب نے علی سجاد سے پھر پوچھا کہ کیا جزیرہ کی یہ تعریف صحیح ہے علی سجاد نے فوراً جواب دیا۔ بالکل غلط۔ انسپکٹر صاحب نے دریافت کیا کیوں غلط ہے علی سجاد نے جواب دیا کہ اس لئے غلط ہے کہ پانی میں درخت کھڑا ہو یا کشتی تیر رہی ہو یا کچھوا تیر رہا ہو ان کے چاروں طرف بھی پانی ہوتا ہے۔ مگر یہ چیزیں جزیرہ نہیں ہوتیں۔ انسپکٹر صاحب نے دریافت کیا۔ اچھا تم جزیرہ کی صحیح تعریف کرو۔ علی سجاد نے فوراً ہی جواب دیا۔ خشکی کا وہ حصہ جس کے چاروں طرف پانی ہو۔ جزیرہ کہلاتا ہے یہ سن کر انسپکٹر صاحب نے دونوں لڑکوں کو رخصت کر دیا۔ اور ہیڈ ماسٹر اور کلاس ٹیچر سے مخاطب ہو کر فرمایا دیکھا آپ نے۔ اس لڑکے نے جتنا سوال تھا اتنا ہی جواب دیا اور جیسا سوال تھا ویسا ہی جواب دیا اتنی اہلیت اور ذہانت میں نے آج تک کسی چوتھے درجہ کے لڑکے میں نہیں دیکھی چنانچہ اس امتحان میں شریک ہونے والے ۶۸ لڑکوں میں علی سجاد اول نمبر آئے۔

علی سجاد مرحوم کو بچپن یعنی اپنی ابتدائی طالب علمی کے زمانہ سے شاعری کا شوق تھا۔ شوق نہیں بلکہ یہ خداداد اور قدرتی صلاحیت شعری کا تقاضا تھا یعنی ان کے دماغ کی قدرتی تشکیل کا فعلیاتی بحران تھا جو موزونیت اور نظم الفاظ کی صورت میں ظاہر ہونے پر مجبور تھا اس دماغی فعلیاتی وفور کو بالکل ایک واضح اور عام مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ بعض بچے اپنی عمر کے آٹھویں یا نویں مہینہ میں ہی کھڑے ہو کر چلنے لگتے ہیں۔ حالانکہ عام طور پر بچے سوا یا ڈیڑھ سال کی عمر میں کھڑا ہونا اور چلنا سیکھتے ہیں یعنی

ساتویں یا آٹھویں مہینے میں چل نکلنے والے بچوں کے نظام عصبی کی ساخت قدرتاً عام بچوں سے جلد اور زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے اور یہ ان پر قدرت کا فیضان ہوتا ہے اسی طرح سے ہر اعلیٰ اور بلند معیار فعل کے لیے تشکیل دماغی بھی قدرت کی طرف سے ایسے ہی بلند معیار کی مہیا ہوتی ہے جس بلند معیار کا فعل کہ اس سے سرزد کرانا مقصود ہوتا ہے چنانچہ سب سے پہلی غزل جو علی سجاد انجم مرحوم کی باقیات صالحات سے وارثتاً اس کے والد کو دستیاب ہو سکی ہے وہ اس وقت کی ہے جب کہ وہ اُردو مڈل اسکول بیانہ ریاست بھرت پور کی چوتھی جماعت میں تھے مارچ سنہ ۱۹۳۶ء/۱۹۳۷ء تھا اور صرف تیرہ یا چودہ برس کی عمر تھی موزونیت، سادگی اور روانیٔ طبیعت کے علاوہ اس غزل میں اس عمر کے رجحان طبیعت اور شوخیٔ اظہار کو ملاحظہ فرمانے کی ضرورت ہے مشاعرے کے لیے غزل کہی جا رہی تھی اور وہ بھی طرحی مشاعرے کے لیے۔ طرح مصرع تھا۔

بندۂ عشق ہوں مذہب سے سروکار نہیں

واضح رہے کہ اس مشاعرے میں معمر اور کہنہ مشق شعرا بھی شریک تھے اور غالباً انجم صاحب ہی سب سے کم عمر شاعر تھے۔ فرماتے ہیں۔

غزل

قابلِ داد اگرچہ میرے اشعار نہیں ۔۔۔ پھر بھی اک لفظ مرے شعر میں بیکار نہیں

کثرتِ کام سے گو لکھ نہیں سکتا میں غزل ۔۔۔ پر مرے درجہ میں مجھ سے کوئی ہوشیار نہیں

مجھ کو حاصل ہے غلامیٔ شہِ دیں[1] کا شرف ۔۔۔ کوئی محروم رہا ہو یہ وہ سرکار نہیں

---

[1] امام حسین علیہ السلام

فضل خالق سے ہوں استاد کا ہمنام جو میں [1] ۔۔۔ شعر کہنا مجھے آسان ہے دشوار نہیں
ہوں جو مداح شہ کون و مکاں میں سجاد [2] ۔۔۔ حشر کا خوف مجھے اس لئے زنہار نہیں

اس ابتدائی غزل پر ادبی تبصرہ غالباً سب سے بہتر یہ ہی ہو سکتا ہے کہ تیرہ یا چودہ برس کی عمر، اور مشاعرے میں غزل پیش کی جا رہی ہے یا کہ اخلاقیات اور مذہبیات کا درس دیا جا رہا ہے اور غزل بھی اس مشاعرے میں پڑھی جا رہی ہے جس میں معمر شعراء اور اساتذہ بھی موجود ہیں بلکہ خود مرحوم کے والد بھی غزل سرا ہو رہے ہیں اس غزل کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ مصرعہ تجویز کرنے والے شعراء کو ان کی تشخیص مصرعہ پر ایک اچھی خاصی تنبیہہ کی گئی ہے۔

اگرچہ اس امر کا ان کی تحریر یا کسی اشارے وکنایہ سے پتہ تو نہیں چلتا ہے مگر میرا ذاتی خیال یہ کہتا ہے کہ پانچ شعر کی یہ مختصر سی غزل غالباً دوران مشاعرہ میں ہی کہی گئی ہے اور میرا یہ گمان اس لئے اور بھی تقویت پاتا ہے کہ کئی موقعوں پر مرحوم نے فی البدیہہ غزلیں اور فی البدیہہ اشعار بھی کہے ہیں۔ چنانچہ ایک واقعہ یہ ہے جو ان کے والد کے ساتھ پیش آیا۔ بابو امیر حسن اختر ایک روز کسی رسالہ میں شائع شدہ ایک مشاعرہ پڑھ رہے تھے طرح مصرع تھا ۔ کھویا ہے کہاں تجھ کو کہاں ڈھونڈھ رہا ہوں۔ بیان کے قافیہ کی قید تھی یہ قافیہ ضرور لکھنا تھا بابو امیر حسن اختر نے دیکھا کہ کسی شاعر نے بیان کا قافیہ اچھا نہیں باندھا تھا۔ اتفاق وقت کہ انجم صاحب بھی انٹرینس کا امتحان دے کر اپنے والد کے پاس آئے ہوئے تھے۔ بابو امیر حسن اختر نے ان کو بلا کر کہا کہ تم اس طرح میں بیان کے قافیہ پر ایک شعر کہہ کر مجھے دکھاؤ۔ گویا یہ بیٹے کی شاعرانہ قوت کا امتحان لینا تھا علی سجاد نے کہا کہ ابھی کہہ دوں

---

[1] آپ کے استاد کا نام بھی سجاد تھا [2] جناب سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

بابو امیر حسن اختر نے کہا ہاں کہدو ۔ علی سجاد نے برجستہ یہ شعر پڑھ دیا ؎

آنکھوں کا اشارہ ہے فقط حسنِ تکلم
لفظوں میں عبث حسنِ بیاں ڈھونڈ رہا ہوں

بابو امیر حسن اختر فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ہے کہ اس تمام مشاعرے میں اس سے بہتر ایک بھی شعر نہیں تھا اسی طرح ایک موقع پر ایک فی البدیہہ غزل بھی کہی ہے ۔

فی البدیہہ غزل

ڈر ہے مجھے ملول مری بیکسی نہ ہو
ظلم و ستم میں دیکھنا کوئی کمی نہ ہو

تو ناتوانِ عشق ہے وہ بزمِ حسنِ یار
رودادِ غم کی اے دلِ مضطر ہنسی نہ ہو

اک روز ادر کوچہ میں میت رکھی رہے
مرنے کی مرے اُن کو خبر آج بھی نہ ہو

مرجائے گا نویدِ طلوعِ سحر سے وہ
بیمارِ غم کی رات الٰہی کٹی نہ ہو

تو خوش کہ کامیاب تری ہر نگاہِ شوق
وہ کیا کرے جسے کوئی امید ہی نہ ہو

خاموش دل مزاج پریشاں نظر اداس
اس طرح بھی کسی کی جوانی کٹی نہ ہو

ان کو طلب کروں گا تصور میں ایک بار
ہنگامِ نزع بالیں پہ یارب کوئی نہ ہو

اٹھتا ہوا قفس سے دھواں دیکھتا ہوں میں
یارب کہیں یہ آگ چمن میں لگی نہ ہو

ایک واقعہ علی سجاد مرحوم کی شاعرانہ قوت اور جدتِ طبع کا اور بھی یادگار ہے ۱۹۴۰ء میں جب کہ انجم مرحوم نویں جماعت کے طالب علم تھے متھرا میں آل یو۔پی و راجپوتانہ بیت بازی کا مقابلہ یعنی میچ ہوا۔ ہر مقام کے اسکولوں سے چار چار طالب علموں کی جماعتیں اس میں شامل ہوئیں ۔ غالباً یہ آٹھ ٹیمیں تھیں جن میں الہ آباد، آگرہ، بنارس، لکھنؤ

کی ٹیمیں بھی شامل تھیں علی سجاد مرحوم کو تقریباً چار ہزار اشعار یاد تھے ایک ہزار دوسرے شعراء کے اور تین ہزار ان کے خود کے کہے ہوئے اور وہ بھی اس درجہ بندی سے کہ ہر حرف سے شروع ہو کر ایک ہی حرف پر ختم ہونے والے اشعار مسلسل پندرہ بیس ہوتے تھے اسی طرح ہر حرف پر ختم ہونے والے اشعار گروہ بندی کے ساتھ تقریباً تین ہزار کہے تھے جو کہ اپنے ادبی معیار میں بہت بلند تھے۔ مثال کے طور پر ان میں سے چند غزلیں آخر کتاب میں ملاحظہ کے لئے درج ہیں۔

چنانچہ بیت بازی کا مقابلہ شروع ہوا اور ٹیمیں ہارتی گئیں آخر میں بھرتپور کے مقابلہ میں ایک ٹیم رہی اس کو بھی شکست ہوئی۔ اس بیت بازی کے مقابلے میں محض علی سجاد کی وجہ سے بھرت پور ہائی اسکول فرسٹ رہا اور شیلڈ حاصل کی۔

ججوں نے جن میں چودہری نظیر الحسن صاحب مرحوم فوق مصنف المیزان[1] چیف جج تھے جب یہ دیکھا کہ یہ لڑکا بہت تیز ہے اور شعر ختم ہونے سے پہلے ہی اسی تختی کا شعر برجستہ اور معیاری پڑھ دیتا ہے تو انھوں نے علی سجاد کا امتحان خصوصی لینا چاہا چنانچہ ہر ٹیم میں سے ایک ایک بہترین لڑکا چنا گیا اور اس طرح سے سات یا آٹھ لڑکوں کو علی سجاد کے مقابل کیا گیا۔ ایک طرف اکیلا علی سجاد اور دوسری طرف یہ سات آٹھ لڑکے۔ غرض بیت بازی شروع ہوئی اور بڑا ٹف مقابلہ ہوا مگر اکیلے علی سجاد نے ساتوں آٹھوں لڑکوں کو شکست دے دی۔ ججوں نے بڑی شاباش دی اور سب سے زیادہ وہ اس امر سے متاثر ہوئے کہ علی سجاد کے اشعار کا ادبی معیار بہت بلند تھا۔

---

[1] یہ کتاب موازنۂ انیس اور دبیر پر بڑے پائے کی کتاب ہے اور ایک وقت بی اے کے کورس میں شامل رہی ہے۔

اس بیت بازی کے مقابلہ کی متھرا میں بڑی شہرت ہوئی۔ وکیل بھرت پور متعینہ متھرا نے مہاراج بھرت پور کو فون پر شیلڈ جیتنے کی اطلاع دی۔ چنانچہ مہاراج کے ایماء سے دیوان صاحب معہ اسٹیٹ بینڈ کے متھرا پہنچے اور علی سجاد کا جلوس بینڈ کے ساتھ تمام متھرا میں نکالا گیا اور باشندگان متھرا نے علی سجاد کو بہت میڈل دیئے۔ چودھری نظیر الحسن صاحب فوق سے چونکہ بابو امیر حسن کی خط و کتابت تھی اس لئے انھوں نے بغرض دریافت بابو امیر حسن کو خط لکھا کہ بھرت پور سے ایک لڑکا بیت بازی کے مقابلہ میں متھرا آیا تھا۔ بڑا تیز اور ہوشیار تھا۔ وہ کس کا لڑکا تھا۔ جواب دیا گیا کہ وہ آپ کا پوتا تھا۔ کیونکہ امیر حسن کے والد اور چودھری صاحب سے برادرانہ تعلقات تھے۔

ایک تیسرا اور آخری واقعہ علی سجاد کی مختصر شاعرانہ زندگی کا یہ اور یادگار رہ گیا ہے کہ بھرت پور میں آل انڈیا جسونت نمائش کے موقع پر آخری دن سالانہ مشاعرہ بھی ہوا کرتا تھا جس میں تمام اطراف و جوانب سے بڑے بڑے مشہور شعراء شامل ہوا کرتے تھے اور وہ سب ریاست کے مہمان ہوتے تھے ۱۹۴۴ء میں مشاعرہ ہونے والا تھا۔ طرح مصرع تھا ؎

دعائیں کر کے بچائی ہے آبرو تیری

قطع نظر طرح مصرعہ کی کم معیاریت کے عرض یہ کرنا ہے کہ مشاعرے سے ایک روز قبل بابو امیر حسن نے اپنے عزیز و اقارب شعراء کو اپنے یہاں جمع کیا کہ کل کے مشاعرے کی غزلیں سن کر جانچ کر لیں۔ چنانچہ سب نے اپنی اپنی غزلیں سنائیں اور داد و ستائش حاصل کی۔ علی سجاد کا نمبر آیا، مطلع پڑھا ایک صاحب نے بہت داد دی۔ علی سجاد نے کہا یہ مطلع آپ اپنی غزل میں لکھ لیں۔ دوسرا شعر پڑھا وہ یہ تھا۔

بکھر گیا تو بنا حسن زینتِ گلشن

سمٹ گیا تو بنی شکل ہو بہو تیری

اس پر بابو امیر حسن نے بہت داد دی۔ کہا بابو جی یہ شعر آپ اپنی غزل میں لکھ لیں غرض غزل کے سب شعر اسیطرح تقسیم کر دیئے۔ بابو امیر حسن نے کہا تم کیا پڑھوگے۔ کہا میں آپکے سامنے کیا پڑھ سکتا ہوں امیر حسن نے کہا نہیں میں چاہتا ہوں کہ تم پڑھو۔ کہا میں اور کہہ لوں گا۔ کہا کل مشاعرہ ہونے والا ہے یہ ہو بہو کا قافیہ والا شعر بہت اچھا ہے یہ تم ہی پڑھنا۔ کہا نہیں میں اسی قافیہ کو دوبارہ کہہ لوں گا اور آپ فرمائیں تو ابھی کہہ دوں۔ کہا۔ اچھا کہو۔ برجستہ شعر پڑھا۔

فلک پہ چاند نہیں ہے کسی مصوّر نے

شبیہ کھینچ کے رکھ دی ہے ہو بہو تیری

غرض اسی روز علی سجاد نے دوسری غزل کہی اور شب کو مشاعرہ میں جا کر پڑھی۔ غزل حاصل مشاعرہ رہی۔ ججوں کو اس غزل کو دیکھ کر اس قدر احساس ہوا کہ انھوں نے علی سجاد کو دوبارہ دیکھنے کے لیے بلوایا۔ علی سجاد کو دیکھ کر اس مشکل میں پھنس گئے کہ بڑے بڑے مسن اور استاد شعرار کو چھوڑتے ہوئے اس نوخیز لڑکے کو اوّل انعام کیسے دیا جائے غزل ایک طرف مجبور کر رہی تھی اور پالیٹیکس دوسری طرف کھینچ رہی تھی آخر ایک صاحب کو اوّل نمبر رکھ کر علی سجاد کو دوسرے نمبر کا انعام دینا ہی پڑا۔

جیسا کہ عموماً نوخیز شاعر ابتداً کرتے ہیں علی سجاد مرحوم نے بھی اپنی شاعری کی ابتدار غزل ہی سے کی۔ شاعری میں صنفِ غزل کو سب سے سہل سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے اس وجہ سے کہ غزل اگرچہ ایک محدود صنفِ شاعری ہے مگر بڑا وسیع میدان تخیئل رکھتی ہے لیکن اس کی وسعت کو کچھ وہی لوگ طے

کر سکتے ہیں جن کے دماغ کو قدرت نے غزل کے عنوان پر ڈھالا ہو۔

غزل کو حقیقی احاطۂ غزل ہی میں رکھنا اور پھر اس میں وسعت پیدا کرنا مخصوص تخیئل کا ہی کام ہے۔ حسن و عشق کے مسائل کے علاوہ دوسرے عنوانات کی غزل میں شمولیت غزل کو غزل کے درجہ سے گرا دینا ہے غزل دراصل انسان کے جذبۂ شہوانی کی ایک منوّر اور معصوم تصویر ہوتی ہے حسن غزل اور معیارِ غزل اس امر پر ہی منحصر ہے کہ اس بظاہر پست درجہ تخیئل کو ایسے بلند اور عفیف حسنِ تخیئل میں پیش کیا جائے کہ عابدِ صد سالہ اور زاہد معصوم شعار بھی وجد کرنے لگیں۔ یعنی جذباتِ شہوانی تموجات عصمت کی صورت میں ارتعاش پذیر ہوں اور پستیٔ اخلاق اکمالِ کردار کی شکل میں جلوہ گر ہونے لگے اور غیر فطری ارتقاً فطرت صحیح کے درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی معلوم ہونے لگے۔ مگر یہ ہے بڑا کٹھن کام۔ اللہ کی محبت اور پیشوایان دین و مذہب سے عشق کو تخیئلات شہوانی کے رنگ میں پیش کرنا غزل کا منہ چڑانا نہیں ہے بلکہ اس کو اپنے اوپر ہنسانا ہے اور اسی بناء پر غزل گو اساتذہ نے اپنے کلام میں اس کا بڑا لحاظ رکھا ہے اور خالص مملکتِ حسن و عشق میں وہ وہ فرمانروائیاں کی ہیں کہ دل ان کی عظمتِ تخیئل کے سامنے جھک جاتا ہے۔ وہ اپنے رنگ میں صاحبِ کمال تھے اور اپنی سج دھج کی وضعداری میں مدت العمر صاحب اقتدار رہے ہیں۔

ہمارے اس جواناں مرگ شاعر نے بھی اپنی اس چھوٹی سی عمر شاعری میں یعنی صرف آٹھ یا نو سال کی مدت میں غزل کے اس اعلیٰ معیار کو برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ اسے اور بلند کر دیا ہے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ وقوفی طور پر تھا یا غیر

وقوفی اور الہامی صورت سے تھا۔ اوّل شعر یا غزل کے وقت سے لیکر آخری وقتِ موت تک کے آٹھ یا نو سال میں اس نے فلسفۂ حسن وعشق کے وہ مراحل طے کئے ہیں۔ جن کو فی زمانہ شعرار اپنی عمر کے ساٹھ یا ستر سال والے دور میں کہیں جاکر طے کر پاتے ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں۔ خطۂ بنگال کی مدح سرائی میں اس کے حسن سیاہ فام کی بنا پر فرمایا گیا ہے۔ شعر

یہ عالم نیا ہے یہ خطّہ جدا ہے

یہاں ذرہ ذرہ میں دل بولتا ہے

اس شعر کا اپنی مسلسل نظم میں تو کیا کہنا ہے حسنِ سیاہ فام کے اعجازی اثر اور اس کی ہمہ گیری اور مادی ذرات کی اثر پذیری اور ان کا تکلم حسن وعشق کے کششی اور انفصالی اثرات کی ایک تڑپتی ہوئی تصویر ہے مگر با ایں ہمہ اتنی ذہن میں کھٹک ضرور پیدا ہوتی ہے کہ بات کچھ خلافِ فطرت سی ہے اول تو یہ کہ دل بولنے کا محاورہ استعمال تو ضرور ہوتا ہے مگر اس کے معنی میں حسن وشباب اور عشق ومحبت کا تخیئل کارفرما نہیں ہوتا بلکہ حقیقت واقعی کے واقع ہونے کی پیش بینی ہوتی ہے۔

مثلاً میرا دل بول رہا تھا کہ ایسا ضرور ہوگا اور یا پھر صاحبانِ ریاضت اور اللہ ہو کے نعرے لگانے والے اپنے دل کو بلایا کرتے ہیں جو بالکل ایک غیر فطری ریاضت ہوتی ہے مفید ہوتی ہے یا مضر کہہ نہیں سکتے۔ مگر خلافِ فطرت ضرور ہوتی ہے جس میں حسن وعشق کے وجدانی اثرات میں سے کچھ نہیں ہوتا اب ملاحظہ کریں کہ دل اور ذرات اور حسن ومحبت کی آمیزشا نے کو

ہمارے اس اسقدر جلد مرجانے والے شاعر نے کس قدر گہرے اور وجدانی تخئیل کے ساتھ بے ساختگی سے نظم کر دیا ہے کہ جس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ کہتا ہے۔

یہ جو بکھرے ہوئے ذرّے ہیں ترے کوچہ میں

ان کو ترتیب اگر دوں تو مِرا دل ہو جائے

یہ حقیقت اور فطرت عشق کا اظہار ہے۔ دنیائے عشق و محبت میں کامیاب زندگی کا یہی کمال ہے کہ دل کی مٹی کے ذرّوں کو بجائے قبر کے کونے کے کوچہ معشوق میں اس طرح سے بکھیر دیا جائے کہ اس کو خبر نہ ہو تا کہ وہ وقتِ خرام اپنے پاؤں ان ذروں سے ہٹا ہٹا کے نہ رکھے اور یہ ایک آخری پامالی کی آرزو ان ذرات دل کی تو پوری ہو جائے۔ اور پھر کس پیارے انداز میں اپنے محبوب کو اس امر سے آگاہ کرتا ہے کہ یہ میرے دل کے ہی تو ذرات ہیں جو تیرے کوچہ میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر ان کو ترتیب دے دوں تو میرا دھڑکتا ہوا دل بن جائے گا۔ مگر نہیں میں ان کو ترتیب دینا چاہتا ہی نہیں ہوں اس لیئے کہ ان کا یہ ہی تو واحد مقصد ہے کہ یہ اسی طرح سے پامال ہوتے رہیں اور تجھے خبر بھی نہ ہو تا کہ تو ٹھٹھک کر کھڑا نہ رہ جائے اور ان ذروں کا لطفِ پامالی جاتا رہے اللہ رے تخئیل کی گہرائی اور اس چھوٹی سی عمر میں اس کا یہ تنوع۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

علی سجاد مرحوم کی طبیعت میں چلبلاپن اور بڑا ادبی اور سنجیدہ مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اپنے ہم عمر دوستوں اور احباب میں وہ بڑے پُرمذاق

اور ہنس مکھ مشہور تھے۔ اور بڑوں کی صحبت میں بڑے سنجیدہ اور متین ہوتے تھے ایک دلچسپ واقعہ ان کی مزاحی طبیعت کا شاہد کار ہے مدرہائی اسکول بھرتپور میں ایک اردو کلاس ٹیچر اپنی کلاس کو غالبؔ کے اشعار سمجھا رہے تھے علی سجاد صاحب اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے کسی اور شغل میں مشغول تھے استاد نے ٹوکا کہ توجہ سے نہیں سن رہے ہو کیا خاک تمھاری سمجھ میں آئے گا دوسرے روز علی سجاد دو مہمل مسدس کے بند لکھ کر لے گئے۔ استاد پھر غالبؔ کے شعروں پر تبصرہ کرنے لگے اور علی سجاد نیچی نگاہ کئے اپنے ان دو بندوں کو دیکھتے رہے استاد صاحب نے پھر ٹوکا تو علی سجاد نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں یہ دو بند پڑھ رہا ہوں میری سمجھ میں ان کا مطلب نہیں آتا۔ استاد نے کہا یہاں لاؤ میرے پاس۔ علی سجاد نے جاکر ان کو دے دیئے۔ اوّل تو وہ بہت غور سے پڑھنے لگے پھر تھوڑی دیر کے بعد فرمایا یہ تمھاری سمجھ سے باہر ہیں میں پھر سمجھاؤں گا غرض وہ کاغذ لے کر انھوں نے اپنے پاس رکھ لیا اور ایک ہفتہ کے بعد علی سجاد کو بلا کر ان اشعار کا مطلب سمجھایا اور کہا سمجھ گئے یا نہیں۔ علی سجاد نے نیچی نظر کر کے کہا جی ہاں سمجھ گیا اور خاموش واپس چلے آئے۔ کچھ عرصہ کے بعد استاد صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ تو بالکل مہمل اشعار تھے یہ علی سجاد کی شرارت تھی۔ ذیل میں دونوں بند نقل کرتا ہوں۔ آپ بھی لطف اٹھایئے۔

۱۔ ہاں اے قلم تفاوت شب آفتاب صبح — محراب قصر شرح نظام عتاب صبح
منت کش ثبات غم باریاب صبح — فرط قیود کیف فریضہ عقاب صبح
نظر محیط عکس شریعت ہواس ہوں
مشاطۂ نشاط غم انعکاس ہوں

۲- میں ہوں رواج پیکر لوح زغن نواز یعنی ضمیم فطرت ممتازی حجاز
زمبور قوس مطرب زخار پاکباز قرطاس عرش غازۂ تنسیخ دی نماز
تقدیم کائنات طلاطم فروش ہوں
تعجیس نسخ خطبۂ غماز ہوش ہوں

غرض اس قسم کا سنجیدہ اور ادبی مزاج اکثر ان کی چلبلی طبیعت سے ظاہر ہوا کرتا تھا اور یہ چلبلا پن نظم میں ہی نہیں تھا بلکہ ان کو تحریر نثر پر بھی کافی عبور تھا۔ ان کی نثری تخلیقات سے صرف ایک خط یادگار رہ گیا ہے جو کہ انھوں نے اپنے بڑے بھائی کو اس وقت لکھا تھا جب کہ وہ اردو مڈل اسکول کی چھٹی جماعت میں تھے اور صرف چودہ سال کی عمر تھی اور جو کہ ضمیمہ آفتاب برادری گزٹ بابت ماہ اپریل و مئی ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ خط کی بجنسہٖ نقل حسب ذیل ہے جس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک چودہ سالہ لڑکے کی ادبی دماغی فعلیاتی قدریں اس کے جسمانی عمری مظاہرات سے کہیں بلند اور اعلیٰ تھیں۔

خط

سید علی سجاد جعفری انجم

جناب بھائی صاحب۔ بعد آداب گذارش ہے کہ اس سے قبل میں آپ کو دو خط روانہ کر چکا ہوں مگر آپ نے ابھی تک ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ غالباً اس کا جواب آپ یہ دیں گے کہ پڑھائی کی وجہ سے فرصت نہیں ملی کیونکہ اس سال انٹرینس کا امتحان دینا ضروری ہے حقیقت میں یہ واقعہ ہے جس سے میں کیا کوئی بھی

انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ فرمایئے کہ آپ نے میرے دونوں خطوں کو شروع سے آخر تک پڑھا تو ضرور ہوگا اور میں خود بھی جانتا ہوں کہ ضرور الف سے بڑی یے تک ختم کیا ہوگا اور اس میں ضرور آپ کا قیمتی وقت صرف ہوگا اس لئے میں اب آپ سے عرض کرتا ہوں کہ میرے اس خط کو آپ نہ پڑھیں۔ کیونکہ اس خط کو بھی اگر آپ پڑھیں گے تو جتنی دیر پڑھتے رہیں گے اتنا ہی آپ کا وقت صرف ہوگا لہذا اب تک جتنا وقت آپ کا اس خط کے یہاں تک پڑھنے میں بیکار صرف ہو چکا وہ تو خیر ہو ہی چکا مگر اب آگے ہرگز نہ پڑھیں اور جہاں تک پڑھ چکے ہیں بس وہیں تک رہنے دیں تاکہ آپ کا وقت بیکار ضائع نہ ہو۔ اس لئے کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں اس لئے بس اب آپ اس کا پڑھنا بند کر دیجئے اور یہاں اب صفحہ بھی ختم ہے اس کو نہ پلٹیئے کیونکہ اس طرف بھی کچھ خاص بات نہیں ہے۔ بیکار آپ کا وقت ضائع ہوگا اور کچھ فائدہ نہ ہوگا یہ دیکھئے بس یہ اس صفحہ کی آخری لائن بھی آگئی اور یہ لیجئے یہ صفحہ کے کونے پر آخری لفظ بھی آپ نے پڑھ لیا بس بند کر دیجئے اور اپنی پڑھائی شروع کر دیجئے کیونکہ آپ کو بہت محنت کرنی ہے۔

ارے آپ تو پڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں حالانکہ میں آپ سے ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ آپ اپنا بیش قیمت وقت ایسے بیکار خط وغیرہ پڑھنے میں صرف نہ کیا کریں اور یہ سچ ہے کہ اگر آپ اپنی کتابوں کے پڑھنے میں اتنا وقت صرف کریں گے تو امتحان میں کامیاب ہو جائیں گے اور اس خط کے پڑھنے سے آپ کو کچھ فائدہ بھی نہ ہوگا۔ مجھے تو اس سال یونیورسٹی کا امتحان دینا نہیں ہے اس لئے میرے پاس تو کافی وقت ہے کیونکہ صرف چھٹے درجے کا امتحان تو دینا ہی ہے اور وہ بھی اردو کا

انگریزی کا نہیں ۔ جس طرح پنجتن کی مدد سے پانچویں درجہ میں فرسٹ آیا تھا اسی
طرح انشاء اللہ چھٹے درجہ میں بھی امید ہے گو حساب میں میرے نمبر حساب سے پاس
کے لائق ہی آئے تھے مگر تواریخ، جغرافیہ اور خاص کر اردو میں بے حساب آئے اسی وجہ
سے میرے درجہ میں وظیفہ پانے کا شرف آپ کی دعا سے مجھے حاصل ہے مجھ کو
کیونکہ مضمون نگاری سے کچھ دلچسپی ہے اس لئے میں تو اپنا یہ بیکار وقت بھی اس
خط کے لکھنے میں کام میں لا رہا ہوں اور کچھ نہ کچھ کام کا کام ہی کر رہا ہوں مگر
آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ کے پاس وقت بیکار ضائع کرنے کے واسطے نہیں
ہے اس لئے آپ اس خط کے پڑھنے میں اپنا وقت صرف نہ کریں اور میرے اس
خط کی بے فائدہ ورق گردانی کو بند کر دیں ۔ یہ لیجئے اب تو دوسرا صفحہ بھی ختم
ہوگیا ۔ اس طرف نہ پڑھیئے گا ۔ دیکھیئے آپ نے تو یہ تیسرا صفحہ بھی شروع کر دیا
حالانکہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس میں آپ کے مفید مطلب کوئی بات
نہیں ہے اور ہوتی بھی کہاں سے کیونکہ بہر حال یہ آپ کے ایک چھوٹے بھائی
کا خط ہے اور ظاہر ہے کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی کو کیا مفید بات بتا سکتا ہے
اس لئے صرف اتنا ہی عرض کرتا ہوں کہ اس میں آپ اپنا وقت صرف نہ کریں اور
یہی آپ کے واسطے مفید ہے اگرچہ آپ کے چھوٹے بھائی کی طرف سے یہ درخواست
ہے اور اگر کسی بزرگ کی طرف سے ہوتی تو یہی نصیحت کہلانے کی مستحق تھی دیکھیئے
نصیحت کے متعلق ایسا لکھا ہوا بتلاتے ہیں کہ اگر دیوار پر بھی لکھی ہو تو اس پر عمل
کرنا چاہیئے ۔ مگر معاف فرمائیے گا کہ آپ ہیں کہ برابر اس بیکار خط کو پڑھے جا رہے
ہیں اور وہ بھی باوجود میری اس مکرر اور سکرر درخواست کے ۔ بس یہیں

تک رہنے دیجئے کیونکہ اس میں آگے بھی سوائے بیکار باتوں کے اور کچھ نہیں
دھرا آپ کو میرے کہنے کا یقین نہیں آتا آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں سچ
کہہ رہا ہوں اور شروع ہی سے سچ کہہ رہا ہوں کہ اس میں کچھ نہیں ہے آپ کو
میرا اتنا بھی اعتبار نہیں کہ میں آپ کو ایک مفید مشورہ دوں اور ایک بیکار
کام کرنے سے منع کردوں اور آپ مان جائیں یہ لیجئے اب تیسرا صفحہ بھی ختم ہو گیا بس
اب ہرگز ہرگز اس کو نہ پلٹیئے۔ واہ یہ بھی خوب رہی آپ نے تو صفحہ پلٹ ہی دیا
اور میں منع کرتا ہی رہا۔ مانا کہ میں آپ کا چھوٹا بھائی ہوں لیکن جب بات معقول
ہوتی ہے تو بڑے بھائی بھی چھوٹے بھائی کا کہنا مان لیتے ہیں کیونکہ ایسے موقع پر یہ
خیال نہیں کیا جاتا کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا کہہ رہا ہے حقیقت
میں بات نفع کی ہے یا نقصان کی۔ کیا آپ یہ خیال فرما سکتے ہیں کہ میں آپ کا نقصان
چاہوں گا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ میں تو آپ کے فائدے کی وجہ سے بار بار عرض کر رہا
ہوں کہ اس بیکار خط کو نہ پڑھیئے۔ ختم کیجئے اس کو آپ جہاں سے بھی ختم کر کے
چھوڑیں گے کم از کم اتنا وقت آپ کا ضرور بچے گا اور یہ بھی آپ کا نفع ہوگا۔ مگر
آپ میری ضد میں اس تھوڑے نفع کو بھی لینا نہیں چاہتے اور برابر خط پڑھتے
چلے جا رہے ہیں اچھا بھائی جان اگر یوں ہی ہے تو یوں ہی سہی۔ میں اب آگے لکھتا
ہی نہیں پھر دیکھوں آپ کیا پڑھتے ہیں۔ نہ میں لکھوں گا اور نہ آپ کچھ پڑھیں
گے۔ میرا لکھنا بند تو آپ کا پڑھنا بند۔ بھلا پھر تو آپ پڑھیئے گا۔ یہ لیجئے میں اب
ختم کر کے فقط والسلام لکھے دیتا ہوں۔ بتائیے پھر آپ کیا پڑھیں گے کیا سادے
کاغذ کو بھی پڑھتے رہیں گے۔ پڑھتے تو کیا دیکھتے ہی رہ جائیں گے اس میں تو کچھ لکھا

ہی نہیں ہے بلکہ بات تو یہ ہے کہ سارے خط میں کچھ ہے ہی نہیں۔

آپ پڑھ کر ضرور سوچیں گے کہ میاں اس بے وقوف نے بات تو کچھ بھی نہیں لکھی خط اتنا بڑا لکھ مارا۔ وہ میں آپ سے پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ نہ پڑھیئے۔ اس میں کچھ نہیں لکھا ہے اس پر بھی آپ اگر مجھ کو بیوقوف بنائیں۔ بہرحال میں آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ آپ کو ہر بات کہنے کا حق ہے لیکن حق یہ ہے کہ آپ کو میرا خط پڑھنے کے بعد کچھ حق نہیں ہے کہ آپ مجھ کو ناحق بیوقوفی کا سارٹیفیکٹ دیں میں تو اب بھی یہہ لکھ رہا ہوں کہ نہ پڑھیئے، رہنے دیجیئے اس میں کچھ بھی نہیں ہے یونہی بیکار الفاظ جمع ہو رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ پڑھنا بند ہی نہیں کرتے۔ اچھا اب تو آپ بند کریں گے یہ لیجیئے میں ختم کرتا ہوں اب آگے کچھ لکھتا ہی نہیں۔ اب پڑھیئے میں بھی تو دیکھتا ہوں کہ آپ کیا پڑھتے ہیں کیونکر اپنا بیکار وقت صرف کرتے ہیں۔ لیجیئے فقط والسلام راقم آپ کا چھوٹا بھائی اور یہ لیجیئے آخر میں میرا نام بھی آگیا بس۔ اب تو بھلا پڑھیئے۔ جب نام کے بعد کچھ ہوتا ہی نہیں تو آپ پڑھیں گے کیا۔ تم نے آخر نہ ماننا ہی نہیں، اچھا اب تم کو بھی قسم ہے اور آگے پڑھو۔

دیکھیئے بھائی جان اب آئندہ آپ کو اچھا خط لکھوں گا اس کو آپ پڑھیئے گا یہ میں نے صرف اس وجہ سے لکھا ہے کہ میں آپ کو لکھوں کہ آپ ایسے بیکار خطوط میں اپنا وقت صرف نہ کیا کریں اور کیا لکھوں۔ فقط آپ کا بھائی۔

سید سجاد علی جعفری سلمہٗ انجم متعلم درجہ ششم
خلف الرشید سید امیر حسن صاحب
پوسٹ ماسٹر (عمر ۱۴ سال)

علی سجاد مرحوم کی اس کم عمری میں یہ شاعرانہ پرواز تخیئل دیکھ کر دل سے اک آہ نکلتی ہے کہ اے کاش اس کی زندگی نے اگر وفا کی ہوتی تو آج وہ شہریار مملکت نظم ہوتا اور بزم شعراء اور ادبا میں اس کا مقام کہیں بلند ہوتا۔ مگر مشیئت ایزدی میں کچھ اسی طرح سے گزر چکا تھا۔ مرضیٔ مولانا ہمہ اولیٰ۔

فقط

راقم دل ملول

ڈاکٹر سیّد منظور حسن جعفری شفاؔ

تبصرہ

صانع حقیقی اپنی قدرتِ کاملہ کے انمول نمونے مختلف صدیوں میں، مختلف ملکوں میں، مختلف حالات میں اور مختلف انسانوں کی شکل میں پیدا کرتا ہے بعض اوقات ایسے ذہین اور طباع انسان اس دنیا میں آتے ہیں جن کی دماغی قوتیں اس درجہ تیز ہوتی ہیں کہ ان کا جسدِ خاکی دماغی قوت کی تندہی اور تیزی کا متحمل نہیں ہو سکتا، ان کی دماغی قوتیں انھیں کھا جاتی ہیں، میں نے جب علی سجاد جعفری کا کلام دیکھا تو مجھے یہی محسوس ہوا، سید علی سجاد جعفری کا کلام اس کی گواہی دیتا ہے کہ یہ بائیس ۲۲ سال کی عمر پر پہنچنے والا اور پھر مر جانے والا شاعر فارسی زبان کے شاعر عرفی شیرازی، عربی ادب کے شاعر ابوتمام اور انگریزی ادب کے ٹامس چیٹرٹن کی صف میں اس لئے کھڑے ہونے کے قابل ہے کہ اگر ان سب کی عمر وفا کرتی تو معلوم نہیں یہ اپنے ملک اور قوم کی ادبی زندگی کو کن بلندیوں پر پہنچاتے مرزا غالب نے شاید ایسے ہی افراد کے متعلق کہا تھا کہ

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

اس جوانمرگ شاعر نے کچھ غزلیں کچھ نظمیں، کچھ قطعے اور کچھ اشعار یادگار چھوڑے ہیں ان کے مطالعہ سے اس کی جودتِ طبع، ندرتِ خیال اور پختگیٔ فکر

کا اندازہ بہ آسانی ہو جاتا ہے، وہ لوگ ابھی بقیدِ حیات ہیں جنھوں نے ۱۹۴۶ء تک سید علی سجاد جعفری کو شعر کہتے دیکھا ہے اور مشاعروں میں شعر پڑھتے سنا ہے اور ایسے کہن سال اور تجربہ کار ادیبوں نے سید علی سجاد جعفری کی بدیہہ گوئی اور شعر طرازی کے کارنامے مجھے سنائے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں اس نوجوان شاعر کا کلام لائے ان بزرگوں کے بیان پر میں ایمان لایا ہوں اس عمر میں زبان اور بیان پر اتنی قدرت صرف اُسی کو حاصل ہو سکتی ہے، جسے مبدار فیض سے فطری قوت و ذہانت عطا ہو چکی ہو۔

مجھے یقین ہے کہ شعر و ادب کے میدان میں تنقید کا علم لے کر چلنے والوں کو سید علی سجاد جعفری کی شعری صلاحیتوں کا جائزہ لینے میں یہ خیال ضرور آئے گا کہ یہ صلاحیتیں اکتسابی نہیں ہیں بلکہ وہبی ہیں اور نوزدہ سال سے زیادہ جس شاعر کی مدت عمر نہ ہو اس کے متعلق خواجہ حافظ کی زبان میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

(sd) سید محمد جعفری عفی عنہ بقلمہٖ

۱۱ مارچ ۱۹۶۸ء

نظمیات

ماہتاب

۱۶؍اکتوبر ۱۹۴۴ء

ماہتاب اے ماہتاب، اے مایہ دارِ رازِ حُسن
حاملِ انوارِ فطرت، اے کرشمہ سازِ حُسن
حسن و آرائش کا نغمہ چھیڑنے آتا ہے تو
شب کے ظلمت آفریں پردوں کو چمکاتا ہے تو
اپنی اس خاموش موسیقی سے کر کے مشتعل
چھین لیتی ہیں تری نیرنگیاں شاعر کا دل
کائناتِ بے خودی میں کیف بھر دیتا ہے تو
سینۂ آفاق کو پُر جوش کر دیتا ہے تو
مصحفِ احساس کی تفسیر ہے تیرا وجود
تیری نورانی شعاعیں زندگی کی ہیں نمود
کیف کا نغمہ کتابِ حسن کی تفسیر ہے
چاندنی فطرت کی گویا ہو بہو تصویر ہے
چاندنی میں اک سکونِ مستقل پاتا ہوں میں
خاموشی کے نغمۂ مبہم میں کھو جاتا ہوں میں
تیری تابش سے گلستانوں پہ چھائی ہے بہار

تری کرنوں میں ہے دریا کی اُمنگوں کا اُبھار
ہے خروشِ روحِ موسیقی تجھی سے خاک میں
تجھ ہی سے شانِ تبسّم ہے خس و خاشاک میں
آبِ دریا کی روانی میں ترنم تجھ سے ہے
رات کی خاموشِ فطرت میں تکلّم تجھ سے ہے
شب کے سناٹے میں اک مبہم سا ربطِ سوز و ساز
اک سکوں افزا ترنم ایک سرودِ جاں نواز
ہر طرف چھائی ہوئی روحانیت کی روشنی
اک خمارِ مستقل سا ایک کیفِ دائمی
جلوۂ فطرت کی ضو یا حُسن کا افسانہ ہے
چاند تیری چاندنی میں نازِ محبوبانہ ہے
سچ بتا یہ دلبری تو نے کہاں سے پائی ہے
کوئی تو ہے جس نے یہ دلکش ادا سکھلائی ہے
روح پرور حسن کا شیریں ترنم تجھ میں ہے
کوئی تو ہے جس کا اندازِ تبسم تجھ میں ہے
کوئی تو ہے جس سے تو نے جامِ کیف آور لیا
کوئی تو ہے جس کے جلوؤں نے تجھے چمکا دیا
اُف تری معصوم تابش اُف تری برنائیاں
کس پری پیکر سے تو نے چھین لیں رعنائیاں

ہاں وہی انجمؔ کے دل میں جان میں شام و سحر
جلوہ فرماں اس طرح ہے جس طرح تو جلوہ گر

۲
جنازہ

جا رہا تھا اک طرف میں دل شکستہ وقتِ شام
مقصدِ نیرنگیٔ قدرت کا کرتا احترام
جب اُٹھی اس عالمِ خاموش میں میری نظر
دیکھتا ہوں اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر
دیکھ کر یہ درد کا خاموش منظر بے نقاب
کائناتِ زیست سے آنے لگا مجھ کو حجاب
ہر طرف مجھ کو نظر آتی تھی غم کی بارگاہ
ہو گیا میری نظر میں صفحۂ عالم سیاہ
نغمۂ تخیلِ غم آگیں فضا ئیں سوگوار
ذرہ ذرہ منظرِ حاضر پہ گویا اشک بار
سینۂ احساس میں یوں زلزلے آنے لگے
نغمۂ جاں سوز کوئی جس طرح گانے لگے
موت کا خاکہ نگاہوں میں مری پھرنے لگا
میری نظروں سے وقارِ زندگی گرنے لگا

چھا گئیں غم کی گھٹائیں میری عقل و ہوش پر
جم گئیں میری نگاہیں پیکرِ خاموش پر
سوچتا تھا، یہ بھی تھا منتِ کشِ بارِ حیات
ایک دن اس کے بھی نغمہ ریز تھے تارِ حیات
اس نے بھی دیکھی تھیں حسن و عشق کی رعنائیاں
چاندنی راتوں میں موجِ آب کی انگڑائیاں
بارگاہِ حُسن میں یہ بھی رہا تھا باریاب
خلوتوں میں تھا اُمنگوں پر جوانی کا شباب
لذتوں کی طرفہ کاری سے رہا تھا اس کو کام
محفلِ عشرت کا اس نے بھی کیا تھا اہتمام
اس نے بھی دیکھے تو ہوں گے زندگی کے سوز و ساز
صبح کے کیف آفریں نغموں کا سحرِ جاں نواز
یہ بھی ہوگا روکشِ نیرنگیٔ حسنِ بہار
مسکراتی کھیلتی رنگینیوں سے ہمکنار
رشکِ محفل ہوگا اس کی زندگی کا بھی نکھار
انبساطِ دہر سے یہ بھی ہوا ہوگا دوچار
کیا ہوا لیکن اب آنکھوں سے خمارِ زندگی
صبح تک تو یہ بھی تھا نازِ بہارِ زندگی
اس کا پہلا سا وہ اندازِ تکلم کیا ہوا

کیا ہوا اس کے لبوں کا وہ تبسم کیا ہوا
کیا ہوئے شیریں ترانے کیا ہوئے وہ زمزمے
کیا ہوئے وہ انبساط و کامرانی کے مزے
کیا ہوئی ہونٹوں کی سرخی کیا ہوئی چہرے کی آب
کیا ہوئیں اس کی بہاریں کیا ہوا اس کا شباب
ارتباطِ غنچہ و گل کی کہانی کیا ہوئی
کیا ہوئی اس کی وہ لحنِ زندگانی کیا ہوئی
ایک دم میں ہو گیا سب منکشف رازِ حیات
ہو گئی گم ایک ہی ہچکی میں آوازِ حیات
راحتیں سرمستیاں، کیف بقا کچھ بھی نہیں
زیست اک رنگین دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں

۳

دعوت سحر

اُف شب فرقت کی وہ سوز آفریں تنہائیاں
کرب، بےچینی، خلش، وحشت، جنوں آرائیاں
رات کی پر خوف خاموشی ہجوم اضطراب
درد کے بے چین، ہنگامے، جنونِ کامیاب
یاس و غم کی مجلسیں، حزن و الم کا اہتمام

محفلِ غم آزما میں ظلمتوں کا اژدھام
انبساط و کیف کے جلووں کی نبضِ مضمحل
اضطراب افزا فضا میں منتشر ذراتِ دل
کائنات عشق کی لغزش شکستِ آرزو
مکتب سوز و خلش میں ایک مبہم گفتگو
شورش ربط جنوں آرائی سے مغموم دل
اختلاطِ دردِ پیہم، انتشارِ مستقل
شب کے سناٹے میں وہ مایوس کن شہنائیاں
بیکسی کے زمزمے ناکامیوں کی داستاں
یاس کے پردوں کی جنبش سے فضا میں ارتعاش
ہجر کی غمگین موسیقی کا سوزِ دل خراش
مضطرب نغموں کی خاموشی میں گم آوازِ دل
پردہ ہائے سوزِ غم میں ڈوبتا سا سازِ دل
کیفیاتِ حزن سے محشر فضا خاموش رات
اضطراب و یاس کی دنیا جنوں کی کائنات
ہجر کے آغوش میں پردرد نغموں کا سرود
یاس و غم کی سازشیں، فکر و تردد کا وجود
محفلِ حزن و الم میں دعوتِ دیوانگی
آرزو کا خونِ ناحق، حسرتوں کی خودکشی

سوزشِ رنج والم سے مضمحل، سازِ حیات
سوگ کے ماحول میں مغموم آوازِ حیات
ہجر کی ہنگامہ آرائی کا اک پُردرد باب
ہر تصور حزن ساماں ہر قیامت کامیاب
عرصۂ ظلمت کے ہنگاموں کا پُرغم شاہکار
اک مسلسل ربطِ گریہ ایک پیہم انتشار
ہوچکا اب تو رگوں میں سرد خونِ زندگی
ہوچکا مایوس غم لحنِ سکونِ ــــ زندگی
پردہ غم آفریں میں ہوچکے گم عقل و ہوش
بارِ غم سے ہوچکا سازِ تمنا بے خروش
عالمِ فرقت میں عیشِ جاودانی کھوچکا
کھوچکا سرمایۂ ذوقِ جوانی کھوچکا
سوگ کے سائے میں افسردہ جوانی روچکی
ہوچکی بس ختم فرقت کی کہانی ہوچکی
ہوچکے ارمان مردہ ہوچکے جذبات سرد
سن چکا بس سن چکا بیمارِ غم نغماتِ درد
کائنات سوزِ غم میں انبساطِ روح دے
اے حیات افزا سحاب تو نشاطِ روح دے

۴

فکرِ لطیف

نئے عنوان سے آرائشیں ہوں بزمِ عالم کی
بدل جائیں سرودِ عیش سے کیفیتیں غم کی
ہر اک ذرّہ ضیائے عشق سے معمور ہو جائے
مزاجِ حُسن سے خود برہمی کافور ہو جائے
بہارِ کیف کی رنگینیوں سے دل بہل جائے
محبت کے اثر سے حسن کی فطرت بدل جائے
کوئی رہرو کبھی واپس نہ ہو ناکام منزل سے
فراقِ گل نہ ہو نالے نہ آتے ہوں عنادل سے
سکوں کی خلوتوں میں اختلاطِ حسن و الفت ہو
دلِ راحت فزا نا آشنائے دردِ فرقت ہو
عروسِ حسن کی فطرت میں رنگِ عشق آجائے
محبت کا ترنم ہر رگِ گل میں سما جائے
فراقِ دوست سے ہوتی نہ ہوں مہجور کن راتیں
نہ گریہ ہو، نہ آہیں ہوں، نہ نالے ہوں، نہ فریادیں
نہ وہ سوزشِ شمع سے پروانہ نہ جل جائے
دماغِ حسن سے کارِ جفا کاری نکل جائے

ہزاروں تابشیں ہوں خندہ زن دنیائے فطرت میں
ہر اک شے آچکی ہو سرحدِ حسن و محبت میں
پیامِ عشق دیتی ہوں گلوں کو بلبلیں گا کر
چمن کو ناز ہو معصوم کلیوں کی جوانی پر
نشاط آور فضا میں منتشر ہوں حسن کے جلوے
خیال آزاد، شوق آزاد ہو، آزاد ہوں سجدے
بہاروں کے خیال و فکر سے نظمِ گلستاں ہو
عروسانِ چمن کی ہر ادا جنت بداماں ہو
بچھادی ہو فضا نے سبز مخمل کوہساروں پر
نسیمِ کیف ساماں حکمراں ہو سبزہ زاروں پر
سرور افزا فضائیں ہوں مثالِ طور جلوے ہوں
طلسماتِ شرابِ حسن سے مخمور جلوے ہوں
فضاؤں کی روش میں نرم و نازک سا ترنم ہو
چمن زاروں کی آرائش بعنوانِ تبسّم ہو
کئے دیتا ہو بے خود حسن کی رعنائی کا عالم
گلستاں کی ہر اک ڈالی پہ ہو انگڑائی کا عالم
مچلتی، تلملاتی، کھیلتی، گاتی ہوئی آئیں
بہار افزا فضائیں کیف برساتی ہوئی آئیں
نظر جھومے، شجر جھومے، فضائے آشیاں جھومے

بہاروں کے نفس سے گلستاں کا گلستاں جھومے
محبت کی حدوں سے منزلوں آگے نکل جائیں
وفورِ بے خودی میں لڑکھڑا کر بھی سنبھل جائیں
جوانی کی سطح پر آچکی ہو لیلیٰ، قدرت
شرابِ کیف سے مخمور ہو محبوبۂ فطرت
نسیمِ صبح آ کر روح پھونکے نبضِ گلشن میں
تجلّی کھیلتی پھرتی ہو رنگینی کے دامن میں
نواسنجانِ فطرت مطمئن ہوں آشیانوں میں
بہارِ کیف زا نغمہ کناں ہو گلستانوں میں
سمٹ آئے گلِ خوش رنگ میں جنت کی رعنائی
وفورِ کیف سے لینی پڑے فطرت کو انگڑائی
عروسِ صبح نغمہ ریز ہو پھولوں کی [illegible] میں
تلے رنگینیٔ حسنِ چمن میزانِ فطرت میں
بہارِ کیف ساماں کی عروسِ نو سنورتی ہو
اشاروں پر مرے دنیائے فطرت رقص کرتی ہو
فضا بھی ہو نشاط افزا ہوائے مطربانہ بھی
حیاتِ مختصر میں آئے اک ایسا زمانہ بھی

۵

حسینِ انقلاب

آپ سے پہلے شوق میں خاک بھی زندگی نہ تھی
عشق میں جاں رہی نہ تھی حسن میں دلکشی نہ تھی

ربطِ سرور و غم نہ تھا، لذتِ زندگی نہ تھی
کوئی الم الم نہ تھا، کوئی خوشی خوشی نہ تھی

ساری فضائے دہر میں چھایا ہوا تھا ابرِ غم
نبضِ جہاں تھی مضمحل، خوں میں کھلبلی نہ تھی

منزلِ حسن وعشق کا بدلا ہوا تھا سب نظام
انجمن جمال میں پہلے یہ تابشی نہ تھی

نقشہ عشق میں ابھی رنگِ جنوں بھرا نہ تھا
محفلِ وجد وکیف میں نام کو بے خودی نہ تھی

ساری فضا خموش تھی سرد تھے نغمہ ہائے شوق
صحن چمن اداس تھا پھولوں میں خندگی نہ تھی

انجم و ماہتاب کی ماند تھیں سب تجلیاں
جلوۂ حسن وناز میں پہلے یہ روشنی نہ تھی

میکدۂ نشاط کے جام وسبو تھے منتشر
کیف نہ تھا شراب میں روح میں تازگی نہ تھی

نغمۂ دل خموش تھا سوئی ہوئی تھی کائنات
ذروں میں یہ چمک نہ تھی تاروں میں روشنی نہ تھی
حسن تھا ناشناس عشق، عشق تھا ناشناسِ حسن
نغمۂ کیف سرد تھا، وجد میں بیخودی نہ تھی
محفلِ حسن تھی اداس کیفِ چمن تھا بے فروغ
لطف نہ تھا بہار میں نغموں میں دلکشی نہ تھی
رازِ دنیاز کی تمام انجمنیں خموش تھیں
چین نہ تھا، سکوں نہ تھا عیش نہ تھا خوشی نہ تھی
آپ جو آئے دفعتاً میرے تصورات میں
لاکھوں ضیا تڑپ اٹھیں بحر تجلیات میں
آگیا انقلاب سا عالمِ معجزات میں
بھر گئیں لاکھ لذتیں زیست کے واقعات میں
حسرتِ دل ہے مطمئن عشق کی کائنات میں
موجِ سکوں ہے موجزن بحر تخیلات میں
صحنِ حریمِ ناز میں موج بہار آ گئی
نغمے سکوں نواز ہیں کیف ہے بات بات میں
انجمن جمال میں آگئی ایک دلکشی
رقص کناں ہیں بجلیاں حسن کی کائنات میں
سارا چمن مہک اٹھا پھولوں پہ آگیا شباب

بھر گئیں لاکھ رنگتیں سوئی ہوئی حیات میں
ابرِ بہار آگیا، جلوے بھی مسکرا دیئے
سنتا ہوں نغمے نغمے کو، ہنستا ہوں بات بات میں
حسن ہے غم گسارِ عشق، عشق نیاز مندِ حسن
آگیا رنگِ دلکشی زیست کے واقعات میں
ساری فضائے حسن میں دولتِ دل ہے منتشر
کیفِ لطیف بھر گیا فطرتِ کائنات میں
ساری فضا مہک اٹھی محفلِ انبساط کی
نغمۂ حسن و عشق ہے انجمن حیات میں
آپ جو آئے آگیا، ایک "حسین انقلاب"
عالمِ معجزات میں فطرتِ کائنات میں

۶

شاعر

صبحِ رنگین کو عطا کرتا ہوں میں تابندگی
میرے دم سے گلستاں کی زندگی ہے زندگی
میری خاطر ہیں عروسِ حسن میں رعنائیاں
شاخِ گل لیتی ہے میرے واسطے انگڑائیاں
نور برساتا ہے بامِ آسماں سے ماہتاب

میرے خوش کرنے کو ہو جاتی ہیں کلیاں بے نقاب
میری دلجوئی کیا کرتے ہیں تارے رات بھر
چلتی ہے میرے لئے گلشن میں ہر بادِ سحر
میری خاطر دامنِ گلشن میں رقصاں ہے بہار
میرے دم سے کوہ و صحرا کی فضائیں کیف بار
یہ چمن ، یہ اَبر ، یہ مخمور جلوے ، یہ فضا
جگمگاتی چاندنی ، یہ نغمہ ہائے کیف زا
یہ سہانی رات ، یہ صبح درخشاں ، یہ بہار
فطرتِ رنگین کی انگڑائی گلشن کا نکھار
موجِ دریا ، یہ سکوتِ شام ، یہ آبِ رواں
جھلملاتی بزمِ انجم ، مسکراتی کہکشاں
جلوۂ خاموش کی مدھوش کن برنائیاں
غنچۂ معصوم کی جنت فزا رعنائیاں
میری فطرت کے ہیں یہ سارے انوکھے شاہکار
تابشِ بزمِ فلک ، نیرنگیٔ لیل و نہار
عشق کا ہر کارنامہ ہے مرے پیشِ نظر
انگلیاں میری رکھی رہتی ہیں نبضِ حسن پر
آشنا ہوں میں زمانہ کے ہر اک انجام سے
میں ہمیشہ کھیلتا ہوں گردشِ ایام سے

مضمحل ذرّوں کی موسیقی کا ہوں میں چارہ ساز
جانتا ہوں موجِ دریا کی ہر اک کروٹ کا راز
جب چمن ہوتا ہے ہنگامِ سحر شورش فزا
میں سنا کرتا ہوں بس شبنم کے گرنے کی صدا
درس لیتے ہیں مجھ ہی سے کوہ و صحرا لالہ زار
میرے دم سے رقص کرتی ہے گلستاں میں بہار
فطرتِ گلشن کو دیتا ہوں تبسم کا پیام
میں سکھاتا ہوں نسیمِ صبح کو طرزِ خرام
ذرّے ذرّے استقلال کے جلوے دکھا سکتا ہوں میں
قوتِ آزادِ عالم آزما سکتا ہوں میں
اپنے مرکز سے ہٹا سکتا ہوں بر کو بحر کو
میں اگر چاہوں بدل ڈالوں نظامِ دہر کو
چھین سکتا ہوں گلوں سے رنگ و بو کی نعمتیں
خار و خس کو بخش دوں باغِ جناں کی عظمتیں
جلوہ ہائے حسن کو نغموں کے سوز و ساز کو
میں بدل سکتا ہوں گلشن کے ہر اک انداز کو
کیف بن کر گلشنِ ہستی پہ چھا سکتا ہوں میں
درد بن کر پردۂ شب میں سما سکتا ہوں میں
ہاتھ سے لے کر خزاؤں کے نظامِ گلستاں

سونپ سکتا ہوں بہاروں کو چمن آرائیاں
کامیاب مدعائے عرش ہے میری نظر
روک سکتا ہوں جہاں چاہوں وہیں شمس و قمر
میرے وہم و فکر سے سارا چمن ہے سر بلند
گلستاں کا پتہ پتہ ہے مرا احسان مند
میرے نغمے سن کے خوش ہوتا ہے فطرت کا مزاج
مجھ کو ہر ذرہ ادا کرتا ہے تحسین خراج
میرے حسنِ فکر کی رفعت پہ نازاں ہے چمن
میرے جلوؤں سے منور ہے فلک کی انجمن
فخر کرتی ہے مری تخییل پر انسانیت
میرے دم سے ہنس رہی ہے محفلِ روحانیت
مشعلِ گیتی، دلِ فطرت، مدارِ آرزو
کارفرمائے گلستاں، پاسبانِ رنگ و بو
رازدارِ منزلِ عظمت، امیرِ کائنات
تاجدارِ ملکِ فطرت، بادشاہِ ممکنات
حاملِ دنیا و دیں، روحِ سخن جانِ طرب
ناظرِ اسرارِ قدرت ناظمِ بزمِ ادب
مرکزِ آفاق، دارائے جہاں، نورِ چمن
تابشِ عالم، بہارِ حسن، شمعِ انجمن

پیکرِ انوارِ فطرت، رازدارِ معجزات
فخرِ موجودات، اسرارِ جہاں، نازِ حیات
گلستاں کا راز، شہرِ رنگ و بو کا بادشاہ
غم شناسوں کا سہارا، بیکسوں کا داد خواہ
جب کہ ہو تلملے فرائض سے زمانہ بے نیاز
غم فزا ہوتا ہے جس دم زندگی کا سوز و ساز
جب بدلتا ہے زمانہ کا مذاقِ زندگی
جب برستی ہے ہر اک دیوار و در سے بیکسی
جب کہ ہو جاتے ہیں بے ترتیب اوراقِ سکوں
حالِ حزن و الم ہوتا ہے جب حالِ زبوں
عرصۂ ہستی میں ہو جاتی ہے جب کوئی کمی
جب رگوں میں ہ   باتا ہے خونِ زندگی
جب کہ ہوتا ہے زمانہ رزم گاہ خیر و شر
بے کسوں کے جب کہ ہو جاتے ہیں نالے بے اثر
دامنِ تہذیب کی اڑتی ہیں جس دم دھجیاں
جبکہ چھاتی ہیں فضاؤں پر الم کی بدلیاں
ساعتیں مفقود ہو جاتی ہیں جب آرام کی
سلب ہو جاتی ہیں جس دم قوتیں اقوام کی
مختصر یہ جب کہ ہو جاتی ہے برہم کائنات

ہچکیاں لیتی ہے جب رک رک کے لیلیٰ حیات
اُس گھڑی میرے ترانے صرف میری جدتیں
باغ عالم سے مٹا دیتی ہیں ساری کلفتیں

۷

عورت

نیرنگِ جوانی ہے کہ ہے نغمۂ فطرت
عورت ہے کہ رنگینیٔ دنیائے محبت
شاداب چمن زاروں کے پھولوں کی جوانی
یا حسن و محبت کی دل آویز کہانی
برسات کی مخمور گھٹاؤں کا مرقع
یا صبح کی پُرکیف فضاؤں کا مرقع
انگشتریٔ حسن کا معصوم نگینہ
یا جنسِ محبت کا پُراسرار دفینہ
نیرنگیٔ جذبات کا اک پیکرِ موہوم
یا سادگیٔ حسن کا اک جلوۂ معصوم
یا رقصِ فسوں ساز کا خاموش نظارہ
یا زمزمۂ حسن کا رنگین اشارہ
صہبائے تجلّی کا فسوں کار تبسّم

تخییل کا نغمہ ہے کہ فطرت کا ترنم
یا انجمن حسن میں نغموں کی نمائش
یا صبح کے ہنستے ہوئے جلووں کی نمائش
یا نشہ میں سیال امنگوں کی روانی
جذبات کی انگڑائی تخییل کی جوانی
مہتاب کی برنائی ہے یا حسن کی آغوش
یا فطرت رنگین کا اک جلوۂ خاموش
تخییل کا خرمن چمن حسن کی تفسیر
جذبات کی دولت شب مہتاب کی جاگیر
یا عالم نیرنگ میں آواز محبت
تخییل کے تابندہ ستاروں کی امانت
رازِ دلِ فطرت ہے کہ ایمان گلستاں
یا انجمن حسن کی اک شمع فروزاں
منشائے جہاں وجہِ سکوں شاہد گلزار
وارفتۂ نیرنگ چمن مطلع انوار
رعنائی خورشید، درخشانی انجم
یا دامنِ مہتاب میں سیلاب تبسم
نیرنگ چمن، کیفِ نظر، غنچۂ شاداب
یا بارگہہ حسن کا اک جلوۂ بے تاب

غزلیات

(۱)

مارچ ۱۹۳۶ء

قابلِ داد اگرچہ مرے اشعار نہیں　　پر مرے درجہ میں مجھ سے کوئی ہوشیار نہیں
کثرتِ کار سے گو لکھ نہیں سکتا میں غزل　　پھر بھی اک لفظ مرے شعر میں بیکار نہیں
مجھ کو حاصل ہے غلامیٔ شہِ[1] دیں کا شرف　　کوئی محروم رہا ہو یہ وہ سرکار نہیں
فضلِ خالق سے ہوں استاد[2] کا ہم نام جو میں　　شعر کہنا مجھے آسان ہے دشوار نہیں
ہوں جو مداحِ شہِ کون و مکاں میں سجّادؔ
حشر کا خوف مجھے اس لئے زنہار نہیں

[1] حضرت امام حسین علیہ السلام [2] آپ کے استاد کا نام بھی سجّاد تھا

(۲)

۲۳/جولائی ۱۹۳۶ء

کسی پہلو نہ گو قرار آیا　　خوب ہی لطفِ انتظار آیا
اس نے اپنا بچا لیا دامن　　راہ میں جب مرا مزار آیا
کھا رہے ہیں مری قسم جھوٹی　　پر مجھے اُن کا اعتبار آیا
چھائی ہے ہر طرف گھٹا غم کی　　دشت میں کون سوگوار آیا
کہہ دیا میں نے بے قصور ہے یہ　　جب وہ محشر میں شرمسار آیا
کچھ تسلّی نہ دی مجھے اس نے　　یوں تو آنے کو بار بار آیا
کب اسیرِ قفس کیا مجھ کو　　ہائے جب موسمِ بہار آیا

کیسا خط کا جواب ہے یارب — آج قاصد بھی شرمسار آیا
کوئی کیا ہمسری حسن کرے — ن پر حسن کو بھی پیار آیا

جب تکلم گیا ہر محشر
سب پکارے گناہگار آیا

(۳)

پھولوں کی مالا

نظم نمائش ــــــــــ ۱۹۳۷ء

کروں مدح و ثنا جتنی نمائش کی وہ زیبا ہے
یہاں رونق سی رونق ہے یہاں میلا سا میلا ہے
یہاں کی گرم بازاری کا دنیا بھر میں چرچا ہے
یہاں پر رات میں بھی آج کل دن کا اُجالا ہے
نمائش کی غرض تعریف ہے انساں سے ناممکن
کرے ضبط قلم کوئی یہ سب حالات کیا ممکن

مہاراجہ سری ہر جند سنگھ جو ہیں ولایت میں
یہ سارا برج ہے اس شاہ والا کی ولایت میں
نہیں ہے آج ثانی ان کا کوئی شان و شوکت میں
نہ ثروت میں نہ صولت میں نہ ہمت میں نہ دولت میں
یہ سب اقبال ان کا ہے نمائش گاہ کو دیکھو
وہ خود آجائیں جب تب ان کے عز و جاہ کو دیکھو

جناب جین کاک اس جا پہ دیوانِ ریاست ہیں
انھیں کے تو یہہ سب ایجا آئین سیاست ہیں
کہ ہیں خوش حال بیوپاری بھی اور اہلِ زراعت ہیں
بڑے ذی علم عالی خانداں فخرِ شرافت ہیں

مسٹر گ بنوادی ڈامر کی بھرت پور میں کمال ایسا
نہ کیوں دلکش بنے افسر ہو جب روشن خیال ایسا

نمائش کے ہیں افسر جو جناب با ترا صاحب
جہاں میں آپ سے حکام دیکھے ہیں کسی نے کب
کہ جن کی مدح گوئی میں رعایا یک زباں ہے سب
ریاست کی ہے بہبودی سے ان کو خاص کر مطلب

انھیں کے فیض کے جاری ہیں چشمے کل ریاست میں
زمینداروں کے ہیں ہمدرد یہہ ہر شکل و صورت میں

نمایاں ہیں یہہ سب آثار ان کی چشمِ الفت کے
دلائل ہیں یہی تو حاکموں کی صاف نیت کے
زمینداروں کے ہیں گویا خزانے مال و دولت کے
جو ان کے باجرہ کے کھیت ہیں اس شان و شوکت کے

خدا کی شان اور سرکار کا اقبال تو دیکھو
نمائش میں رکھی ہے ڈیڑھ گز کی بال تو دیکھو

ہے اس بحرِ کرم کا فیض ہر جا اس قدر جاری
کہ جس کے ذکر کرنے سے ہے گفتارِ قلم عاری
درختوں سے زمیں بھر ڈالی کی ہے ایسی گل کاری
مویشی لینے آتے ہیں یہاں ہر جا سے بیوپاری

ستارہ کس قدر چمکا بلندی پر ریاست کا
کہ ناظم واقعی ناظم ہے یاں ہر اک نظامت کا

علاوہ ان کے بھی ہیں میمبر جو اس ریاست کے
عیاں ہر ایک پر جوہر ہیں ان کی قابلیت کے
انھیں معلوم ہیں وہ سب جو ہیں آئین سیاست کے
وہ ہی حکام ہیں اس جا جو ہیں لائق حکومت کے

کہ میرٹھ اور علی گڑھ کی نمائش مات ہے دیکھو
تماشہ شان قدرت کا یہاں دن رات ہے دیکھو

ترقی علم سے ہے علم ہے ہر اک کو یاں حاصل
ریاست کا نہیں ہے اب کوئی فردِ بشر جاہل
جدھر دیکھو مدرسے میں ہے ہر اک مولوی فاضل
کہ جن کے دیکھیے شاگرد بھی ہیں آج اس قابل

ارادہ کر لیا جب نظم یہہ پہلے پہل لکھدی
ہوں طالب علم درجہ پانچ کا اور بر محل لکھدی

حقیقت میں نمائش ہے نمائش میں حقیقت ہے
نمونہ دیکھئے آکر یہاں معراج صنعت ہے
نہ اس میں جھوٹ ہے مطلق نہ اس میں کچھ مشیخت ہے
کہ اب ساری ریاست گویا اک گلزار جنّت ہے
علی سجّاد یہ نظمِ نمائش سب سے اعلیٰ ہے
اُچھوتے گل پروئے ہیں یہ وہ پھولوں کی مالا ہے

(۴)

نظم نمائش ــــــــ سنہ ۱۹۳۸ء

(طالب علم درجہ اسپیشل کلاس)

نہیں بے وجہ دنیا بھر میں شوروغل نمائش کا
لکھا ہے حال اخباروں میں دیکھو کل نمائش کا
مہکتا ہی رہے دائم خدایا یہ گُل نمائش کا
چہکتا ہی رہے تاحشر یہ بلبل نمائش کا
نمائش تو بہت سی ہو رہی ہیں آج دنیا میں
مگر سرسبز ایسا تو نہیں ہے راج دنیا میں

مہاراجہ سری برجندر ہیں والی ریاست کے
کہ یورپ والے ہیں مداح جس شاہِ ولایت کے
یہاں بھی ہو رہے ہیں جابجا چرچے شرافت کے

ہیں قائل دل سے سب خورد و کلاں ان کی لیاقت کے
دعا مقبول ہو یارب مری وہ جلد آجائیں
لگیں پھر چار چاند ایسے مقدر جگمگا جائیں

ہیں سی یو حین کاک اس جا پریسیڈنٹ بھی قابل
امور سلطنت میں آپ سا دیکھا نہیں کامل
ریاست میں ہر ایک پودا ترقی پر ہوا مائل
یہاں گل کاریاں کرنے لگے ہیں خود ہی آب و گل
پھر تیور کو ہمارے آپ نے گلشن بنایا ہے
چمن قربان ہوں جس پر یہاں وہ بن بنایا ہے

ہیں آر ایل باترا صاحب نمائش گاہ کے افسر
ہیں ان کی کر سکوں تعریف ہے امکان سے باہر
جو دیکھے انتظام ان کا کہے حیرت زدہ ہو کر
کہ ہیں میٹل روشن فلک پر جیسے ہوں اختر
خوشی ہے عید کی حاصل یہاں جنگل میں منگل ہے
کہیں ہیں سینما تھیٹر کہیں سرکس میں دنگل ہے

علی گڈھ اور میرٹھ کی نمائش خاک کر ڈالی
کہ صنعت اور حرفت سے ریاست ساری بھر ڈالی
جب اس بحر کرم نے سرسری سی اک نظر ڈالی
کھلی کشت تمنا ہو گئی سر سبز ہر ڈالی

غزل خواں ہیں کہیں شاعر یہاں باہر سے آ آ کر
مویشی بیچتے ہیں اک طرف بیوپاری لالا کر

کیا ہے ایگمری کلچر کا ایسا محکمہ جاری
کہ گلشن بن گئی ہے اب ریاست کی زمیں ساری
نمائش میں دکانیں بن گئیں ہیں پختہ سرکاری
نلوں سے میٹھے پانی کے ہیں چشمے ہر طرف جاری

کروں تعریف کیا بازار کی افراط ساماں ہے
نہ ملتی ہو کہیں جو شے یہاں وہ شے فراواں ہے

مرا درجہ بھی اور نظمِ نمائش بھی ہے اسپیشل
یہی ہے وہ کہ جس کو ایک گھنٹہ میں لکھا تھا کل
مگر پھر اتنی اعلیٰ ہے حقیقت میں رہی اوّل
یہ مشکل مسئلہ تھا پر کیا فکر و قلم نے حل

خدا کی دین ہے صاحب کسی کا کیا اجارہ ہے
عروسِ نظم کو انجمؔ بڑی جلدی سنوارا ہے

۵

مصرعِ طرح ۔ کیا مرتبہ دیا ہے خدا نے شراب کو ——— ۱۱ مئی ۱۹۳۹ء

حد سے بڑھا دیا ہے مرے اضطراب کو | غیروں کے ہاتھ بھیج کے خط کے جواب کو
قربان گاہِ عشق میں ناکامیاں مری | تسکین دے رہی ہیں مرے اضطراب کو

ناصح جمالِ یار کی تعریف کیا کروں — بس اتنا یاد ہے کہ اٹھایا نقاب کو
مدت کے بعد وصل میسر ہوا ہے آج — لِلّٰہ درمیاں سے اٹھا دو حجاب کو
مدت سے بیکلی تھی مبارک ہو اے ہلالؔ — وہ آج بام پر ہیں اٹھائے نقاب کو

۶

مصرعہ طرح :- ہر ایک نفس کو منزل سمجھ رہا ہوں میں ——— ۱۲/ مئی ۱۹۳۹ء

یہ زندگی کو خود اپنی سنوارتا ہوں میں — کہ گام گام پہ دل دل پکارتا ہوں میں
کسی کے وعدۂ فردا پہ مطمئن ہو کر — لحد میں چین سے واللہ سو رہا ہوں میں
تو مجھ سے پوچھتا ہے کیا پتہ مرا نادان — کسی کے نقشِ کفِ پا پہ مر مٹا ہوں میں
قریبِ مرگ جو آئیں یہ ہچکیاں مجھ کو — کسی کو نزع میں کیا یاد آ رہا ہوں میں
رہے وفورِ محبت میں بستگی اے دل — کہ خود کو ہجر کا قصہ سنا رہا ہوں میں
مری طرف بھی وہ انگلی اٹھی کسی کی ہلالؔ — زہے نصیب کہ اس رخ کو دیکھتا ہوں میں

۷

مصرع طرح :- مٹی خراب ہو گئی میرے مزار کی ——— ۱۲/ مئی ۱۹۳۹ء

حالت تو دیکھ لو ذرا بیمارِ زار کی — ٹوٹی ہے آس اب تو دلِ بیقرار کی
پرواہ کیا لحد میں ہے شمع مزار کی — ہو گی تجلّی داغِ دلِ شعلہ بار کی
ہے وقتِ نزع رخ سے اٹھا دیجئے نقاب — یہ آرزو ہے اک دلِ حسرت شعار کی
رخ سے نقاب اٹھتے ہی بے ہوش ہو گیا — تعریف کیا کروں میں بھلا حسنِ یار کی

نظروں سے گو نہاں ہوئے مدت ہوئی مگر — تصویر اب بھی دل میں ہے فصلِ بہار کی
بیٹھے ہیں بے حجاب میرے پاس آج وہ — کچھ حد نہیں ہے رحمتِ پروردگار کی
وقتِ اخیر آتی ہیں کیوں ہچکیاں ہلالؔ — یاد آ رہی ہے کیا انھیں مجھ بیقرار کی

(۸)

مصرع طرح :- دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنادے ——— ۱۳ر مئی ۱۹۳۶ء

شبنم کو مے تو پھول کو پیمانہ بنادے — اس باغ کو رنگین سا میخانہ بنادے
مخمور نگاہوں سے ہی اس دل کو تو ساقی — بس دیکھتے ہی دیکھتے خم خانہ بنادے
وہ بزم میں ہشیار رہے جس کی یہ صدا ہے — تو جلوہ دکھا کر مجھے دیوانہ بنادے
پینے کو مئے عشق مناسب تو ہے ساقی — پر دل کو بڑا سا مرے پیمانہ بنادے
چاہت کی ہلالؔ آخری منزل ہے یہ یارب — ہر ذرہ جہاں بے خود و دیوانہ بنادے

(۹)

مصرع طرح :- بے اختیار ہو کر میں کہہ گیا فسانہ ——— ۱۳ر مئی ۱۹۳۹ء

موجوں میں آب کی ہے مدھم سا اک ترانہ — یا کہہ رہا ہے مجھ سے کوئی مرا فسانہ
بجلی کو دیکھ کر اب بلبل یہ کہہ رہی ہے — تھا گلستاں میں کوئی میرا بھی آشیانہ
تھا ابر آسمان پر محفل میں دورِ مے تھا — ایسا بھی اپنا اے دل گذرا ہے اک زمانہ
آنکھیں ملا کے اس نے مجھ کو جہاں سے کھویا — یہ ہے مری کہانی یہ ہے مرا فسانہ
مایوس ہو نہ جائیں ارمان میرے دل کے — پردے ہی سے سنا دے اپنا اسے ترانہ

ان کا نزع میں آنا آنکھیں مرا چھپانا
وہ وقت بھی تھا کتنا خاموش اور سہانا

اب تک ہلالؔ اس نے یہہ ایک کھیل کھیلا
تیر مژہ کا اپنے دل کو کیا نشانہ

⑩

مصرع طرح :- مجھے دردِ دل کی دوا چاہیئے ـــــــ ۱۴ مئی سنہ ۱۹۳۹ء

بتاؤں محبت میں کیا چاہیئے
فقط عشق کی انتہا چاہیئے

یہہ ہے عشق اور حسن کا فیصلہ
وفا کے صلہ میں جفا چاہیئے

مجھے تیری رنگیں ادا چاہیئے
محبت کی بس یہ فضا چاہیئے

ادھر ہے نقاب اور ادھر اضطراب
عنایت تری اے صبا چاہیئے

ہوں بیہوش سب اہلِ محفل ابھی
نقاب ان کے رُخ سے اٹھا چاہیئے

یہی عاشقوں کی ہے بس زندگی
محبت میں ان کو فنا چاہیئے

بجا لائے گا حکم عاشق ترا
ذرا اتنا کہہ دے کہ کیا چاہیئے

نہ کافر بتوں سے تو دل کو لگا
کہ بندے کو یادِ خدا چاہیئے

ترا بھی ہے ان کو خیال اے ہلالؔ
اب اس کے سوا اور کیا چاہیئے

⑪

مصرع طرح :- منہ دکھانے کی کوئی حشر میں صورت نہ رہی ـــــــ ۱۵ مئی سنہ ۱۹۳۹ء

ہم پہ جس دن سے تری چشم عنایت نہ رہی
دل میں دل بستگی چہرہ پہ مسرت نہ رہی

کھینچ لی میں نے تصور ہی میں تصویر تری
تیرے دیدار کی اب مجھ کو ضرورت نہ رہی

دردِ دل اُٹھتا ہے تعظیم مسیحا کے لئے
اس تنِ زار میں تو اٹھنے کی طاقت نہ رہی

میں ترے عشق میں بدنام ہوا ہوں اتنا
منہ دکھانے کی کوئی حشر میں صورت نہ رہی

اور بھی ہو گیا بسمل انھیں جب دیکھ لیا
ان کے الطاف کی اب مجھ کو ضرورت نہ رہی

کب بنایا گیا مٹی سے مری پیمانہ
ہائے اس شوخ کو جب مے کی ضرورت نہ رہی

ہے حقیقت میں یہہ ہی عشق کی تکمیل ہلالؔ
اب تجھے حسن کے دیدار کی حاجت نہ رہی

ہو گئی عشق کی تکمیل حقیقت میں ہلالؔ
بے خودی مل گئی دیدار کی حاجت نہ رہی

(۱۲)

مصرع طرح :- جان سے ایمان سے میں اس پہ قرباں ہو گیا　　　　۲۰ مئی ۱۹۳۹ء

کس قدر مجھ کو خیالِ روئے جاناں ہو گیا
میری نظروں میں ہر اک ذرہ درخشاں ہو گیا

بام پر پھر کوئی فتنہ گر نمایاں ہو گیا
میرے لٹ جانے کا پورا پورا ساماں ہو گیا

لاکھ پردوں میں نہاں گو رُوئے تاباں ہو گیا
پھر بھی ہر ذرہ میں ظاہر حسن پنہاں ہو گیا

جب تصور میں مجھے دیدار جاناں ہو گیا
جاں سے ایمان سے میں اس پہ قرباں ہو گیا

کیا کوئی مرقد پہ میرے آگیا ہے بے نقاب
آج روشن کس لئے گورِ غریباں ہو گیا

کس طرح نکلوں میں باہر خوف سے صیاد کے
اب تو گلشن میں نشیمن مجھ کو زنداں ہو گیا

اُف تری ترچھی نظر کی یہ غضب گلکاریاں
جس طرف دیکھا وہیں گنجِ شہیداں ہو گیا

بعد مُردن میں گیا کاندھوں پہ اپنی قبر تک
مرتے مرتے بھی تو مجھ پر بار احساں ہو گیا

پھر رہا ہوں میں جنوں میں اس قدر دیوانہ وار
عشق کی وادی کا ہر ذرہ پریشاں ہو گیا

جب گلستاں کے تصور میں مجھے نیند آگئی
پھر تو خود گلزار مجھ کو میرا زنداں ہو گیا

شام کو وہ بام پر جس وقت آیا اے ہلالؔ
دیکھ کر اس کو نہاں ماہِ درخشاں ہو گیا

(۱۳)

مصرع طرح :- نئے انداز سے مجھ پر نئی بیداد کرتے ہیں ۱۳ مئی ۳۹ء

بہار فصلِ گل میں آشیاں برباد کرتے ہیں
گلستانوں میں آکر وہ ستم ایجاد کرتے ہیں

بہت سنتے رہے ہنس ہنس کے تم اغیار کی باتیں
کلیجہ تھام کر بیٹھو کہ ہم فریاد کرتے ہیں

دم نزع مجھے آتی ہے ہر ہر سانس پر ہچکی
گماں ہوتا ہے مجھ ناکام کو وہ یاد کرتے ہیں

تصور میں بھی ہے ہر وقت چہرے پر نقاب اُن کے
نئے انداز سے مجھ پر نئی بیداد کرتے ہیں

برائے فاتحہ آتے ہیں وہ اغیار کو لے کر
پسِ مردن بھی مجھ ناکام پر بیداد کرتے ہیں

ہماری بیخودی کا فرط الفت میں یہ عالم ہے
وہ دل میں جلوہ فرما ہیں انھیں کو یاد کرتے ہیں

ہلاؔل آتے ہیں اب وہ چاند سی صورت دکھانے کو
خدا کا شکر ہے وہ آج ہم کو شاد کرتے ہیں

(۱۴)

مصرعِ طرح : یاد ہیں وہ دن کہ رنج و غم سے میں بیگانہ تھا — یکم جون ۱۹۳۹ء

یاد ہیں وہ دن کسی کے عشق میں دیوانہ تھا
اور کسی کا جامِ اُلفت پی کے میں مستانہ تھا

یاد ہیں وہ دن کسی شمع کا میں پروانہ تھا
اور اپنے عشق کے انجام سے بیگانہ تھا

یاد ہیں وہ دن نظر میں جلوۂ جاناناں تھا
جس جگہ میں جھوم کر بیٹھا وہی میخانہ تھا

یاد ہیں وہ دن مِرا ان سے کبھی یارانہ تھا
یاد ہیں وہ دن کہ رنج و غم سے میں بیگانہ تھا

یاد ہیں وہ دن ہر اک روتا تھا میرے حال پر
اور زباں پر ہر بشر کے میرا ہی فسانہ تھا

یاد ہیں وہ دن مجھے کچھ فکرِ عالم میں نہ تھی
میرا دل خود اصل معنی میں عجب مستانہ تھا

یاد ہیں وہ دن کہ تھا میں سرفرازِ عاشقی
یاد ہیں وہ دن کہ بزمِ عیش تھی پیمانہ تھا

یاد ہیں وہ دن کہ وہ تھا پھول تو میں عندلیب
وہ اگر تھا شمعِ محفل اس کا میں پروانہ تھا

یاد ہیں وہ دن کہ تھی سرگرم بزمِ انبساط
ہم نفس، ہم راز، ہر دم یہ دلِ دیوانہ تھا

یاد ہیں وہ دن کہ اک رنگین سا میخانہ تھا
ہم تھے اور گردش میں ان کی بزم میں پیمانہ تھا

یاد ہیں وہ دن کہ تھا میں ہمکنارِ زندگی
یاد ہیں وہ دن کہ سجدے تھے درِ جانانہ تھا

یاد ہیں وہ دن کہ تھا میں بے نیازِ اضطراب
یاد ہیں وہ دن اُنھیں طرزِ ستم آیا نہ تھا

یاد ہیں وہ دن کہ تھا میں کامیابِ آرزو
میں تھا، ساقی تھا، شراب کیف تھی، میخانہ تھا

اب وہی میں ہوں مگر تبدیل عالم ہو گیا
جو کہا میں نے وہ مثلِ خواب تھا، افسانہ تھا

اب وہی میں ہوں کہ لاتا ہوں خیالِ خام کو
دل اسی الجھن میں ہے افسانہ تھا کبھی یا نہ تھا

اب وہی میں ہوں مگر وہ محفلیں جاتی رہیں
خوش تھا میں جب تک تجھے طرزِ ستم آیا نہ تھا

اب وہی میں ہوں مگر مجنونِ راہ عشق ہوں
مجھ کو تیری بے نیازی کا کچھ اندازہ نہ تھا

اب وہی میں ہوں مگر مایوسِ امید کرم
تھی مجھے راحت کہ جب تو ظلم سے بیگانہ تھا

اب وہی میں ہوں کہ خود ہی سعد رہا ہوں اے ہلالؔ
ایسا ہوتا ہے ثمر الفت کا میں سمجھا نہ تھا

(۱۵)

مصرع طرح:۔ پھر مجھے آخر گمانِ عشق کامل ہو گیا
۵ رجون ۱۹۳۹ء

اب مجھے بے شک یقینِ عشق کامل ہو گیا
خون کے اشکوں میں حل ہر ذرۂ دل ہو گیا

ذرہ ذرہ اب نظر میں ان کی منزل ہو گیا
اب تو شاید عشق میرا عشقِ کامل ہو گیا

دل مرا مائل ہوا جب کوئے جاناں کی طرف
اس کا ہر ہر ذرہ میرے حق میں قاتل ہو گیا

شمعِ جاں سوز کیوں روتی ہے اس شدت سے آج
محفلِ شب میں کوئی پروانہ گھائل ہو گیا

ذرہ ذرہ میں رُخ محبوب آتا ہے نظر
ہو مبارک تجھ کو اے دل عشق کامل ہو گیا

آئے بھی تو کب برائے پرسشِ بیمار غم
جب مجھے تعظیم کو اُٹھنا بھی مشکل ہو گیا

کس لئے ہم بات کو بھی اپنے کھوئیں اے ہلالؔ
جب تصور ہی میں لطف وصل حاصل ہو گیا

(۱۶)

مصرع طرح: صبح شب فراق الہٰی کبھی نہ ہو
فی البدیہہ

ڈر ہے مجھے ملول مری بیکسی نہ ہو
ظلم و ستم میں دیکھنا کوئی کمی نہ ہو

تو ناتوانِ عشق ہے وہ بزم حسنِ یار
روداد غم کی اے دل مضطر ہنسی نہ ہو

اُٹھتا ہوا قفس سے دھواں دیکھتا ہوں میں
یارب کہیں یہ آگ چمن میں لگی نہ ہو

اک روز اور کوچہ میں میّت رکھی رہے
مرنے کی میرے ان کو خبر آج بھی نہ ہو

مرجائے گا نویدِ طلوعِ سحر سے وہ
بیمارِ غم کی رات الٰہی کٹی نہ ہو

تو خوش کر کامیاب تری ہر نگاہِ شوق
وہ کیا کرے جسے کوئی امید ہی نہ ہو

خاموش دل، مزاج پریشاں نظر اداس
یوں ہجر میں کسی کی جوانی کٹی نہ ہو

ان کو طلب کروں گا تصوّر میں ایک بار
ہنگامِ نزع بالیں پہ یارب کوئی نہ ہو

(١٧)

چاک گلشن میں ہر اک گل کا گریباں دیکھ کر
بڑھ گیا جوشِ جنوں وحشت کا ساماں دیکھ کر

میرے تلوؤں کا ہر اک چھالہ شرر انگیز ہے
ان پہ منہ ڈالیں ذرا خارِ مغیلاں دیکھ کر

کیا انھیں بھی لذت اندوزی کا چسکا پڑ گیا
زخم کیوں مرجھا گئے خالی نمکداں دیکھ کر

داورِ محشر کو لگ جائے گا قاتل کا پتہ
ان کا داماں دیکھ کر میرا گریباں دیکھ کر

پنجۂ صیاد میں بے بس تھے ہم مجبور تھے
ہائے کیا کیا یاد آیا ابرِ باراں دیکھ کر

ہے تقاضائے محبت کوئی برہم ہو نہ جائے
نالۂ شب گیر اے بیمارِ ہجراں دیکھ کر

اے جنوں تو ہی بتا اب میں کروں تو کیا کروں
موسمِ گل یاد آیا ہے گریباں دیکھ کر

یوں شبِ فرقت میں جینے کی کسے امید تھی
جی اُٹھا بیمارِ غم جلوؤں کا ساماں دیکھ کر

ہم یہ سمجھے تھے کرم ہم پر بھی ہوگا اے ہلالؔ
اور شورش بڑھ گئی خالی نمکداں دیکھ کر

۱۸

مصرع طرح :- دل دیا غم سے آشنائی کی

اس نے پھر تیغ آزمائی کی — خیر ہو خیر اس کلائی کی
جس سے کی تو نے بیوفائی کی — بن پڑی ہے تری خدائی کی
آپ بالائے بام ارے توبہ — انگلیاں اٹھ گئیں خدائی کی
دل وحشت نواز نے مارا — ہے دُہائی تری خدائی کی
کہہ رہی ہے نگاہ دل لے کر — داد تو دیجئے صفائی کی
کچھ تو کیجئے علاج درد جگر — شرم رکھ لیجئے خدائی کی
وہ ادھر چپ ہیں میں ادھر خاموش — ہائے معصومیت جدائی کی
کیا کروں میں علی کے وصف بیاں — تھا تو بندہ مگر خدائی کی

میں نے سجدے کئے محبت میں
لاج رکھ لی تری خدائی کی

۱۹

مصرع طرح :- مزار قیس پہ چادر چڑھائی جاتی ہے

ہر ایک چیز پہ وحشت سی چھائی جاتی ہے
نقاب کیا کہ قیامت اُٹھائی جاتی ہے
مریض ہجر جہاں سے گزر گیا شاید

تماشہ دیکھنے ساری خدائی جاتی ہے

خموش اے دلِ ناداں یہ کیا قیامت ہے
کہ طبعِ نازنیں اب تھرتھرائی جاتی ہے

بہارِ گل میں نشیمن کے چار تنکوں پر
ہزار طرز سے بجلی گرائی جاتی ہے

فضا اداس ، زمانہ خموش دل بے چین
یہ کس شہید کی میّت اٹھائی جاتی ہے

کسی کا خرمنِ دلِ خاک ہو گیا جل کر
مگر ہنسی ہے کہ ہونٹوں پہ آئی جاتی ہے

تجھے جو آنا ہے اے موسمِ بہار آجا
نہیں تو برقِ نشیمن پہ چھائی جاتی ہے

یہ اٹھ کے کون چلا ہائے میری بالیں سے
کہ مجھ پہ گویا قیامت سی آئی جاتی ہے

نہ کر تو تذکرۂ موت بار بار اے دل
یہ تجھ سے کہہ تو دیا ہے کہ آئی جاتی ہے

یہ کس نے شاخِ چمنی آشیاں بنانے کو
کہ برق سارے گلستاں پہ چھائی جاتی ہے

نظر نظر میں ہے طوفانِ حشر کا ساماں
قدم قدم پہ قیامت اٹھائی جاتی ہے

(۲۰)

مصرعہ طرح :۔ دامن پکڑ لیا ہے ترے انتظار کا

دل بستگی کو اپنی تصور ہے یار کا
کچھ غم نہیں ہے ہم کو غمِ انتظار کا

یہ دیکھنا ہے کیسے ہو طے راہِ حسن و عشق
وہ اختیار کے ہیں نہ دل اختیار کا

وہ ہیں کہ آرہے ہیں عیادت کے واسطے
دل ہے کہ کچھ پتہ نہیں جس کے قرار کا

یہ کیا کہ عرضِ حال پہ خاموش ہو گئے
یوں توڑتا ہے دل کوئی امیدوار کا

تڑپا ہوں کیسے صورتِ بسمل تمام رات
تاروں سے پوچھو حال شبِ انتظار کا

دامن پہ اپنے خون کے چھینٹوں کو دیکھ کر
دورِ خزاں میں ہے مجھے دھوکا بہار کا

کلیاں خموش، سبزہ نگوں سر، چمن اداس
افسانہ کہہ رہا ہوں دلِ غم شعار کا

نکلا ہے سیرِ باغ کو شاید وہ نازنین
منہ زرد پڑ گیا ہے عروسِ بہار کا

بھولے سے آج وہ جو چلے آئے ہیں ادھر
ہے عرش پر دماغ زمینِ مزار کا

سر پر لیے کھڑا ہوں گناہوں کی کائنات
ہے امتحان رحمتِ پروردگار کا

(۲۱)

مصرع طرح :۔ جہاں پر بیٹھ کر پی لوں وہی میخانہ ہو جائے

کرم تیرا اگر اے جلوۂ جاناں ہو جائے
جبینِ شوق کے سجدوں کا اک افسانہ ہو جائے

انھیں تو کام ہے جادو جگانے سے سرِ محفل
بلا سے ان کی ہو تم ہے کوئی دیوانہ ہو جائے

نگاہِ مست میں اتنا تو ہو اعجاز اے ساقی
کہ پیمانہ میں پیدا وسعتِ میخانہ ہو جائے

کچھ اس اعجاز سے ہو شمع روشن تیری محفل میں
کہ پیدا ا[illegible] پروانہ سے پھر پروانہ ہو جائے

یہ ہی انداز حسن و عشق ہیں دنیائے الفت میں
کوئی دیوانہ کر ڈالے کوئی دیوانہ ہو جائے

اُدھر خنجر بکف تم ہو ادھر میں سر بسجدہ ہوں
جو تم چاہو تو پورا آج یہ افسانہ ہو جائے

لئے بیٹھا ہوں دنیا کے غموں کو اپنے سینے میں
نہ جانے کونسا غم حاصل افسانہ ہو جائے

(٢٢)

مصرع طرح :- اب ہم نگاہ لطف کے قابل کہاں رہے

دو چار روز دل میں جو وہ میہمان رہے
ہر ہر نگاہ حاملِ صد گلستاں رہے

چاہے وہ لاکھ پردوں میں یارب نہاں رہے
لیکن مری نگاہِ محبت وہاں رہے

کھلتے ہی در اسیرِ قفس پھر کہاں رہے
رہ بھی گئے تو ایک ہمیں ناتواں رہے

صحنِ چمن میں شاخ رہے آشیاں رہے
رہتا ہے بدگمان اگر باغباں رہے

صیاد مجھ کو قید ہی کرلے تو خوب ہے
خوفِ خزاں رہے نہ غمِ آشیاں رہے

دل جس طرح سے رہ گیا وادیٔ عشق میں
یارب نہ راہ میں یوں کوئی کارواں رہے

تیری نظر پہ ختم ہیں سب سربلندیاں
تیری نظر سے گر کے کوئی پھر کہاں رہے

دل بے قرار آپ کے جلوے بھی بیقرار
پھر کیسے رازِ حسن و محبت نہاں رہے

لے دے کے آشیانہ تھا اک وہ تو جل چکا
گلشن میں اب بہار رہے یا خزاں رہے

اے برق میں نے تجھ کو تڑپنا سکھا دیا
مجھ کو دعائیں دے کہ مرا آشیاں رہے

۲۳

مصرع طرح :۔ تم نے تو محبت کی ہر رسم اُٹھا ڈالی

چہرہ پہ نقاب اپنے یہہ آپ نے کیا ڈالی
گویا کہ مرے دل کی دنیا ہی چھپا ڈالی

ہم نے تو محبت میں ہر چیز لٹا ڈالی
لے دے کے جوانی تھی اک وہ بھی مٹا ڈالی

اے برق نشیمن کے تنکوں کو کہاں رکھوں
تو نے تو گلستاں کی ہر شاخ جلا ڈالی

ناکام کی تربت سے کیا کام ہے اب تم کو
وہ چونکہ مٹانی تھی آخر کو مٹا ڈالی

جاں سوز مصیبت تھی جل جانا نشیمن کا
کیا سوچ کے قدرت نے یہہ مجھ پہ بلا ڈالی

خود داورِ محشر نے دل تھام لیا اپنا
یہہ کس نے محبت کی روداد سنا ڈالی

گلشن میں گھٹائیں بھی پھر آئیں تو کیا آئیں
جب ہم نے نشیمن میں خود آگ لگا ڈالی

معصوم سی آنکھوں میں معصوم سے آنسو ہیں
کیوں میں نے شب غم کی روداد سنا ڈالی

دنیائے محبت میں اک حشر سا برپا ہے
تم نے رُخِ تاباں سے کیا چیز اُٹھا ڈالی

صیاد قفس میں ہم اور تذکرۂ گلشن
تو نے تو مرے دل کی ہر چوٹ دکھا ڈالی

چلمن بھی اٹھا دیں گے یہ دعویٰ تو مشکل ہے
ہاں ہم نے قیامت تو سو بار اٹھا ڈالی

سجدے جو تڑپتے ہیں اب کیسے کروں ان کو
تم نے تو کفِ پا کی ہر شکل مٹا ڈالی

ان مست نگاہوں نے بدنام کیا مجھ کو
مدہوشی کے عالم میں ہر بات سنا ڈالی

(۲۴)

مصرع طرح :۔ کام آپڑا ہے رحمت پروردگار سے

جاتے ہوئے نہ روک سکا جب مزار سے
کیا کام ہو سکے گا دلِ بیقرار سے

اٹھتا دھواں جو دیکھا دلِ بیقرار سے
ارماں لپیٹ کے روئے مرے قلبِ زار سے

فرقت میں ساری رات تڑپتے ہیں کس طرح
یہ حال پوچھیے کسی بیمارِ زار سے

کوئی سکون و صبر کی صورت نہ دیکھ کر
بہلا رہا ہوں دل کو ترے انتظار سے

اب دیکھیے کہ ان سے ملے کس طرح نگاہ
وعدہ تو کر لیا ہے دلِ بیقرار سے

اترائی پھر رہی ہے چمن میں زہے نشاط
کیا کہہ دیا گلوں نے عروسِ بہار سے

اب دل کو وہ وصال کی حسرت نہیں رہی — مانوس ہو گیا ہوں شبِ انتظار سے
سارا جہانِ آرزو تھرا کے رہ گیا — جانا غضب تھا آپ کا میرے مزار سے
لے جائے اس قفس کو اڑا کر چمن کے پاس — اتنا بھی ہو سکا نہ ہوائے بہار سے
رودادِ غم پہ اب وہ توجہ نہیں رہی — کیا کہہ دیا ہے آپ نے پروردگار سے
میں بیٹھ کر قفس میں نشیمن کی شاخ کا — نقشہ بنا رہا ہوں گریباں کے تار سے
پہلی ہی بار ہو گئی تکمیلِ بندگی — جھک کر اٹھا نہ سر مرا پھر پائے یار سے

صیاد کی بھی آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
کیا کیا لپٹ کے رو دیا ہوں ابرِ بہار سے

٢٥

مصرع طرح: چلا ہوں درد کی سوغات لے کر ان کی محفل سے

کسی نے آج نظریں پھیر لی ہیں اپنے بسمل سے
گلے مل مل کے ارماں رو رہے ہیں تیغ قاتل سے
مرے قبضے میں ہے اب کائناتِ رنگ و بو ساری
نگاہوں میں تجھے لے کر اٹھا ہوں تیری محفل سے
ہوا پُر زور، طوفاں خیز موجیں، ناخدا برہم
پھر اس پر یہ قیامت ہے کہ کشتی دور ساحل سے
کرم اے بے خودیٔ دل، مددائے ذوقِ نظارہ
کہ منزل آشنا ہو کر رہا جاتا ہوں منزل سے

زمانہ چپ، زمیں مضطر، فلک گریاں، فضا ساکن
جنازہ آج کس کا اُٹھ رہا ہے کوئے قاتل سے

زباں خاموش، چہرہ زرد، دل بیتاب، نم آنکھیں
اُٹھا ہوں آج میں بن کر تماشہ تیری محفل سے

نہیں معلوم کشتی بحرِ الفت میں کہاں ڈوبی
ابھی موجیں گئی ہیں ڈھونڈتی ٹکرا کے ساحل سے

رگیں ساری مرے زخمِ جگر کی ٹوٹی جاتی ہیں
یہہ کون انگڑائیاں لے کر اٹھا جاتا ہے محفل سے

انھیں احساس ہوتا یا نہ ہوتا اس سے کیا حاصل
مگر رودادِ ضبطِ غم کبھی سنتے تو بسمل سے

نہ دیکھا رونے والا جب شہیدِ ناز پر کوئی
تو ارمان روئے ہیں کیا کیا لپٹ کر قبرِ بسمل سے

دفورِ شوق سے اب ہوش اتنا بھی نہیں انجمؔ
کہ نکلا جا رہا ہوں بے خودی میں دور منزل سے

(۲۶)

مصرعۂ طرح :- سو حسن بڑھ گئے ہیں آدابِ بندگی میں

افسردہ ہو گئے ہیں ناراض اپنے جی سے
سو بار مر چکا ہوں دو دن کی زندگی میں

بہلے کسی طرح تو دل شامِ بیکسی میں
داغوں کو گن رہا ہوں تاروں کی روشنی میں

کچھ کہہ دیا ہنسی میں کچھ سن لیا ہنسی میں
ایسا بھی اک زمانہ گزرا ہے زندگی میں

کھا کھا کے ٹھوکریں سی اس راہِ عاشقی میں
کچھ پھول چن رہا ہوں دامانِ زندگی میں

آنکھوں میں بیٹھے بیٹھے آنسو جھلک اٹھے ہیں
کیا جانے کہہ دیا کیا ان سے ہنسی ہنسی میں

بیمارِ ہجر شاید پھر جی اٹھے شبِ غم
اے آنے والے آجا تاروں کی روشنی میں

برقِ نگاہ دل پر اک بار پھر گرا دے
درکار ہے اضافہ سامانِ زندگی میں

دنیائے غم کی خاطر دنیائے دل مٹا دی
ایسے بھی کھیل ہم نے کھیلے ہیں زندگی میں

موسیٰ کریں گے آخر مجھ سے مقابلہ کیا
وہ کوہِ طور پر تھے میں ہوں تری گلی میں

اس جا ہزار کعبے بن جائیں احتراماً
جس جا میں سر جھکا دوں اکبار بیخودی میں

انجمؔ وہ سجدے جن پر ہوں دو جہاں تصدق
ہم نے کئے ہیں سجدے ایسے بھی بیخودی میں

(۲۷)

مصرع طرح ۔ دعائیں کر کے بچائی ہے آبرو تیری (مشاعرہ نمائش ۔ بھرت پور ۱۹۴۴ء)

نہ جانے کیسی قیامت تھی آرزو تیری — کہ بن کے رہ گیا تصویر ہو بہو تیری
جبینِ شوق جھکاؤں کہاں کہاں یارب — تجلیاں نظر آتی ہیں چار سو تیری
تڑپ تڑپ کے پہنچتا ہوں تیغ کے نیچے — مچل مچل کے نکلتی ہے آرزو تیری
نکل رہا ہے جنازہ تو نام کو میرا — نکل رہی ہے حقیقت میں آرزو تیری
اٹھانا بارِ تجلّی محال تھا لیکن — بچالی طور نے جل بجھ کے آبرو تیری
اسی طرح سے میں جیتا رہوں قیامت تک — رہے یوں ہی مری بالیں پہ گفتگو تیری
ہے نامرادی کے کاندھوں پہ میتِ ناشاد — یہہ کیسی دھوم سے نکلی ہے آرزو تیری
فلک پہ چاند نہیں ہے کسی مصور نے — شبیہہ کھینچ کے رکھ دی ہے ہو بہو تیری
بکھر گیا تو بنا حسن زینتِ گلشن — سمٹ گیا تو بنی شکل ہو بہو تیری
یہہ بھی تو دہر میں مل کر بنیں گی افسانہ — اک آرزو ہے مری ایک آرزو تیری

سرِ نیاز جہاں پر جھکا دیا انجمؔ
وہیں پہ بن گئی تصویر ہو بہو تیری

(۲۸)

مصرع طرح :۔ سنا کرتے ہیں کلیوں کا ہوا سے مسکرا دینا

مٹا نا ہے تو اے برقِ تپاں سب کچھ مٹا دینا
سمجھ کر آشیاں میرے قفس کو بھی جلا دینا

جہاں جھک جائے دل اس جا جبیں کو بھی جھکا دینا
ہر اک ذرہ کو راہِ عشق میں کعبہ بنا دینا

گلستاں کی جدائی اک عذاب جان تھی مجھ کو
قیامت ہو گیا اس پر نشیمن کا جلا دینا

دلِ افسردہ کے نالے نہ ٹکرا جائیں یہہ غم ہے
ہجومِ ناامیدی اک ذرا سا راستہ دینا

یہاں تو مٹ گئی برقِ تپاں دنیائے دل ساری
تجھے تو کھیل تھا ان چار تنکوں کا جلا دینا

یہ ممکن ہے مری تاریک دنیا بھی چمک اٹھے
ذرا نظروں میں نظریں ڈال کر تم مسکرا دینا

جو تم چاہو تو جی جاؤں جو تم چاہو تو مر جاؤں
تمہارے ہاتھ ہے شب کا گھٹانا اور بڑھا دینا

قفس کو کر چلا ہوں رشکِ گلشن خوں کے چھینٹوں سے
چمن والو مرے ذوقِ اسیری کو دعا دینا

رہیں گی بس یہہ ہی دو یادگاریں رہتی دنیا تک
مرا آنسو بہانا اور ان کا مسکرا دینا

وہ طرزِ جلوہ فرمائی ابھی تک یاد ہے انجمؔ
نقابِ رُخ اٹھانا اور اُٹھا کر پھر گرا دینا

(۲۹)

تجلّیِ رخِ تاباں جہاں جہاں ہوگی ادا نمازِ محبت وہاں وہاں ہوگی
قفس میں مجھ کو نہ اب فکرِ گلستاں ہوگی کہ شاخِ گل سے ہی تعمیرِ آشیاں ہوگی
جو کانپتے ہوئے ہونٹوں پہ اک فغاں ہوگی تمام دردِ محبت کی ترجماں ہوگی
مٹی مٹی بھی اگر شکلِ گلستاں ہوگی تو پتی پتی پہ تصویرِ آشیاں ہوگی
دمِ سحر مری یوں ختم داستاں ہوگی ادہر تو آخری ہچکی ادھر اذاں ہوگی
تڑپنے دے ارے قاتل مجھے تڑپنے دے یہہ ہی تڑپ تو مری جانِ داستاں ہوگی
زمیں اُداس زمانہ خموش وہ ساکت یہہ کس شہید کی روداد غم بیاں ہوگی
وہ ایک نزع کی ہچکی نہ تھی قیامت تھی تڑپ کے رہ گئی ہوگی اَجل جہاں ہوگی
سنا ہے برق گری ہے کسی پہ گلشن میں یقین ہے وہ مری شاخِ آشیاں ہوگی
تڑپ تڑپ کے گریں گی یہہ بجلیاں کب تک کہ شاخ شاخ پہ تعمیرِ آشیاں ہوگی
اَجل بھی آئی ہے اور وہ بھی آنے والے ہیں مکمل آج محبت کی داستاں ہوگی
زہے نصیب کہ میّت ہے ان کے کاندھوں پر تڑپتی ہوگی مری زندگی جہاں ہوگی
یہہ دیکھتا ہوں جلاتی ہیں بجلیاں کیونکر تصورات میں تعمیرِ آشیاں ہوگی

قدم قدم پہ مٹایا گیا ہوں میں انجم
خبر نہیں مری تربت کہاں کہاں ہوگی

شعر

آنکھوں کا اشارہ ہے فقط حسنِ تکلم لفظوں میں عبث حسنِ بیاں ڈھونڈ رہا ہوں

(۳۰)

مصرع طرح :- ہم بھی خوش ہوں گے انھیں محشر میں گریاں دیکھ کر

قید میں کرتا بھی کیا وحشت کا ساماں دیکھ کر
بس تڑپ کر رہ گیا ابرِ بہاراں دیکھ کر

صبر کر اے موت تھوڑی دیر کو تو صبر کر
کیسے مر جاؤں میں ان کو یوں پشیماں دیکھ کر

کشتگانِ عشق نے آنکھیں پھرا لیں سوئے چرخ
خندہ زن ان کو سرِ گورِ غریباں دیکھ کر

بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی ہے وحشتِ دل اس قدر
خواب میں بھی ہاتھ اٹھتا ہے گریباں دیکھ کر

موت آئی تھی مگر اک کشمکش میں پڑ گئی
میری بالیں پر حیاتِ نو کا ساماں دیکھ کر

چند تنکوں ہی سے تو ہم نے بنایا تھا مگر
خود جلا ڈالا نشیمن برق سوزاں دیکھ کر

پھر تڑپ کر کشتگانِ عشق زندہ ہو نہ جائیں
پاؤں رکھیئے گا سرِ گورِ غریباں دیکھ کر

زرد چہرہ، آنکھ نم، افسردہ نظریں، دل اداس
محشرِ غم بن گیا ہوں شامِ ہجراں دیکھ کر

زندگی بھی تنگ رہی ہے آج حسرت سے مجھے
میرے مرقد پر کسی کو گل بداماں دیکھ کر

ذرہ ذرہ شدت انوار سے بن جائے دل
مسکرا دیں وہ اگر خاک شہیداں دیکھ کر

نیچی نیچی سی نگاہیں بکھرا بکھرا سا شباب
کھویا کھویا ہو گیا ہوں روئے تاباں دیکھ کر

کیا کہوں انجمؔ مآل جوشش وحشت کیا کہوں
کانپ جاتی ہے مجھے دیوار زنداں دیکھ کر

(۳۱)

روشن ہے شمع حسن جو میرے مزار پر — پروانوں کے پڑے ہیں لحد پر ہزار پر
اس درجہ بڑھ گیا ترا آخر مذاق ظلم — گریاں ہوا رقیب بھی اس حالِ زار پر
پھر جا پڑا ہے ہاتھ گریبان پر مرا — آئی ہے کیا بہار گلستاں بہار پر
کہدے کوئی ہوا سے کہ آہستہ چل ذرا — وہ آرہے ہیں شمع جلانے مزار پر
اللہ رے اضطرابیٔ مضطر شب فراق — ہے برق کا گمان دلِ بیقرار پر

انجمؔ نہ جاتا کوچۂ قاتل میں میں کبھی
ہوتا جو اختیار دلِ بیقرار پر

۳۲

مصرع طرح - کوئی رومال کس کر باندھ دینا چشمِ قاتل پر

نہ آجائے ترس ان کو کہیں اندازِ بسمل پر
ذرا رومال کس کر باندھ دینا چشمِ قاتل پر

میں وہ ناکام عاشق ہوں تر ابحرِ محبت میں
ہزاروں بار پلٹی میری کشتی آکے ساحل پر

الٰہی ہو تو کیونکر ہو تسلی کی مری صورت
نہ قابو ہے مرا ان پر نہ قابو ہے مرا دل پر

نہ ہے قسمت شہادت پائی ہے تو اس طرح میں نے
نظر تھی تیغِ قاتل پر تو سر زانوئے قاتل پر

تمنائیں مری دل کی ہی دل میں رہ گئیں آخر
کیا آزاد بھی کب جب کہ تھے اُڑنے کے قابل پر

مری کشتی بھی غرقِ بحرِ الفت ہونے والی ہے
زباں پر نام ہے ان کا نظر ہے عینِ ساحل پر

کہاں سے آگئے تجھ میں یہ اندازِ تڑپ انجمؔ
کہ ہے اب برق بھی قرباں تری بیتابئ دل پر

دمِ آخر یہ آیا کون انجمؔ برلبِ ساحل
پلٹ آئی جو کشتی تیری پھر اک بار ساحل پر

۳۳

نہ جانے کونسی سرزد ہوئی ایسی خطا مجھ سے
کہ قاصد بھی تو ان کا ہو گیا بے حد خفا مجھ سے

مری مجبوریاں دنیائے الفت میں ارے توبہ
شبِ فرقت قضا بھی ہو گئی آخر خفا مجھ سے

وہی فرقت وہی وحشت وہی مشکل وہی غم ہے
تصور میں وہ کیوں آنے کا وعدہ کر گیا مجھ سے

ملال و رنج و درد و غم قدم بڑھنے نہیں دیتے
تری محفل میں کیونکر داستاں ہو گی بیاں مجھ سے

نہیں دیتا کسی کا ساتھ مشکل میں کوئی انجمؔ
جدا منزل بہ منزل آبلہ ہوتا رہا مجھ سے

(۳۴)

کوئی الفت کے راز کیا جانے — کیوں کھنچی تیغِ ناز کیا جانے
ہے عبث تیری گفتگو ناصح — تو محبت کے راز کیا جانے
لذتِ وصل لطفِ مے نوشی — زاہدِ پاک باز کیا جانے
مسکراتے ہیں جو سرِ بالیں — وہ محبت کے راز کیا جانے
دردِ فرقت، تڑپ خلش، وحشت — کوئی غم کے یہ راز کیا جانے
کیا کہے گا مرا وہ حالِ زبوں — نامہ برِ دل کا راز کیا جانے
کیا خطا ہو گئی ہے بسمل سے — کیوں رُکا دستِ ناز کیا جانے

اس کے جلووں میں کھو گیا انجمؔ
کب ادا کی نماز کیا جانے

(۳۵)

جلوہ فرما جو کہیں وہ مہِ کامل ہو جائے
ایک طوفاں سا بپا لبِ ساحل ہو جائے
بیکراں بحرِ محبت میں ہیں طوفان مگر
ڈوبے جس جا مری کشتی وہی ساحل ہو جائے
اس کے ہر وار پہ کچھ اور سنبھل جاتا ہوں
بدگماں مجھ سے نہ یارب مرا قاتل ہو جائے

کوئی بتلائے کہ اب کس کا کروں میں شکوہ
جب کہ خود میرا مسیحا مرا قاتل ہو جائے
یہہ جو بکھرے ہوئے ذرّے ہیں ترے کوچے میں
ان کو ترتیب اگر دوں تو مرا دل ہو جائے
یاد تیری جو سلامت ہے تو کیا غم انجم
لاکھ دشوار اگر عشق کی منزل ہو جائے

(۳۶)

مصرع طرح :- جلوۂ بسملؔ نظر آجائے یہ مشکل نہیں

گر ترا تیرِ نظر تسکین دہِ بسمل نہیں
عشق اپنے عشق کے درجہ میں بھی کامل نہیں

کشتیٔ دل ہے مری موجِ حوادث میں اسیر
ناخدا کیا بحرِ الفت کا کہیں ساحل نہیں

یاں بجائے شمع دل جلتا ہے بزمِ عشق میں
میری خلوت گاہ سے بڑھ کر تری محفل نہیں

طالبِ بسملؔ اٹھا دل سے ذرا اپنے حجاب
پردۂ ہستی ہے حائل پردۂ محمل نہیں

کیوں نظر کرتا ہے مجنوں تو ہر اک شے کی طرف
عشق دھوکا دے رہا ہے پردہ محمل نہیں

(۳۷)

اک شبِ فرقت میں نالہ کر لیا
ہم نے جب چاہا سویرا کر لیا

اے جمالِ یار یہہ کیا کر لیا
اک زمانہ بھر کو شیدا کر لیا

رکھ کے گردن کو تہہِ شمشیر ناز مختصر فرقت کا قصہ کرلیا
اب تو موجوں نے بھی بحرِ عشق میں مری کشتی سے کنارہ کرلیا
اے جنوں تجھ کو بھی کچھ معلوم ہے بیخودی میں کس کو سجدہ کرلیا
دل میں رہ کر بھی ہے چہرہ پر نقاب تم نے پردہ میں بھی پردہ کرلیا
سجدہ گاہِ عشق عالم ہوگئی
جس زمیں پر ہم نے سجدہ کرلیا

شعر

جلائے جا تو اے صیاد میرے آشیانہ کو بنائے جاؤں میں باقی ہے جبتک دم میں دم میرا

(۳۸)

اک بار مرے صبر و سکوں کو مٹا کے دیکھ ہاں پھر اسی طرح سے مجھے مسکرا کے دیکھ
تجھ کو نہ پھونک دے تو مری آہ دل پہ خاک اے برق میری شاخ نشیمن پہ آ کے دیکھ
اے ذوق دید ترکِ ادب مصلحت نہیں
دیکھ ان کو پر خیال کی دنیا میں لا کے دیکھ

فی البدیہہ

مصرع طرح:۔ پڑھ کے بسم اللہ پی لینا ہمارا کام تھا

دل میں تھی تصویر تیری لب پہ تیرا نام تھا
وقت نزع تیرے عاشق کو بہت آرام تھا

وقتِ آخر تک نہ آئے وہ عیادت کو مری
عشق کا آغاز تھا جو کچھ وہی انجام تھا

موسمِ باراں میں ہم کو کس قدر آرام تھا
میکدہ تھا، میں تھا، ساقی تھا، سبو تھا جام تھا

جب بھی آنکھیں پھیر لیں ہیں ہو گیا بیمارِ غم
مسکرا کر جب نظر کر لی مجھے آرام تھا

قتل کرنا یا نہ کرنا یہ تو تھی ان کی خوشی
سر جھکا دینا تہہِ شمشیر میرا کام تھا

(۳۹)

مصرع طرح :- مجھ کو نگاہِ ناز سے دیکھا نہ کیجئے

اس کشتۂ ستم کو ستایا نہ کیجئے
غیروں کو لے کے قبر پہ آیا نہ کیجئے

کچھ تو علاج کیجئے دلِ بیقرار کا
برباد کیجئے اگر اچھا نہ کیجئے

پھر زندہ ہو نہ جائے کہیں کشتۂ ستم
ٹھوکر مری لحد کو لگایا نہ کیجئے

میرا جو ذکر بزم میں آیا تو یوں کہا
اس خانماں خراب کا قصہ نہ کیجئے

حسرت جبیں کو ہے جو جبیں سائی کی بہت
نقشِ قدم کو اپنے مٹایا نہ کیجئے

بے چین دل کو اور بھی بے چین کر دیا
یوں بے نقاب بام پہ آیا نہ کیجئے

متفرقات

کوئی کر دیتا تو کتنا مختصر سا کام تھا
میں چراغ صبح تھا یا آفتاب شام تھا

اُٹھ رہی تھی نعش میری حشر کا ہنگام تھا
ایسے عالم میں بھی ہنس دینا تمھارا کام تھا

سن کے جس کو سو گیا میں اک دوامی نیند میں
موت کی ہچکی نہ تھی وہ آخری پیغام تھا

انجم جعفری کے چند متفرق اشعار جو ان کے دوست شاعر علی مہدی صاحب سے ملے

قفس کی تیلیوں پر خون کے دھبے بتاتے ہیں
شکستہ بازوؤں میں قوتِ پرواز باقی ہے

صیاد فصل گل کا اشارہ اگر ہوا
اُڑ جاؤں گا قفس کو پروں پر لئے ہوئے

یوں گوشۂ چمن میں ہے سوکھے گلوں کا ڈھیر
گویا کہ ہے بہار کی تربت بنی ہوئی

حسرت نکل رہی ہے رُخ نامراد سے
یہ کون جا رہا ہے تمنا لئے ہوئے

سن کر کرو گے کیا مرے اسرارِ زندگی
اک داستاں ہے درد کی دنیا لئے ہوئے

ناکامیوں نے مردۂ صد سالہ کر دیا
پھرتا ہوں آپ اپنا جنازہ لئے ہوئے

ناکامیوں میں میری پنہاں ہے کامرانی
اک کام کر رہا ہوں ناکام زندگی میں

وہ تیغ بکف آئے ہوئے ہیں سر مقتل
ایسے میں کوئی ان کو مرا نام بتا دے

اے برقِ نشیمن تو جلایا ہے کئی بار
جب جانوں قفس میں بھی مرے آگ لگا دے

بہارِ فصلِ گل میں کون یہ رخصت ہوا ہم سے
کہ اس کے بعد پھر کلیاں نہ چٹخیں صحنِ گلشن میں

کب ہم کو کیا دیکھئے صیاد نے آزاد
جب بھول گئے راستہ صحنِ چمن ہم

اب تو قفس سے دیکھ کے فصلِ بہار کو
اس طرح خوش ہوں جیسے مرا آشیانہ ہے یہ

قطعہ

کھِلتی ہوئی کلیاں ہیں برستا ہوا پانی
ترتیب میں لاتی ہے محبت کی کہانی

بھیگی ہوئی راتیں ہیں نکھرتی ہوئی دنیا
ایسے میں تڑپتی ہے جوانی کو جوانی

دیگر

دِل ناکام سے اک کام لئے جاتا ہوں
اپنی نظروں کو لبِ بام لیے جاتا ہوں

زرد رُخ، آنکھیں ہیں نم، دل ہے پریشان مگر
بھولنے والے ترا نام لئے جاتا ہوں

○

لاکھ پتوں میں نہاں ہے آشیاں اپنا مگر
یہ گزرگاہِ بجلی کا دہاں ہو جائے گا

کس طرح سے بے کلی اپنی دکھاؤں ان کو میں
دردِ دِل آنے سے ان کے خود نہاں ہو جائے گا

ہم تصور ہی سے دل بہلائیں گے اپنا ہلالؔ
جلوۂ رخ گر ان آنکھوں سے نہاں ہو جائے گا

○

حسن تجلیاتِ منساییں نہ پوچھ
گویا کہ ایک چشمۂ شعر و شباب ہے

بہارِ فصلِ گل آتے ہی یہ کون ہو گیا رخصت
کہ اس کے بعد پھر کلیاں نہ چٹخیں صحنِ گلشن میں

کلیاں خموش سبزہ پریشاں چمن اداس
افسانہ کہہ رہا ہوں عروسِ بہار کا

ابیات

(برائے بیت بازی)

واعظ

ان سے کچھ واسطہ رکھتا نہ میں اصلا واعظ
میرے کہنے میں جو ہوتا دلِ شیدا واعظ

اک زمانہ تھا کہ پیتا تھا میں دن رات مگر
مے پیئے اب تو مجھے ہو گیا عرصہ واعظ -

اب تو رہتی ہے اداسی سی سرِ میخانہ
اک قیامت ہوتی یہ آپ کا آنا واعظ

آئے میخانہ میں مے نوشوں کے سمجھانے کو
مل گیا آپ کو آنے کا بہانہ واعظ

ان کے عارض کا نہ ہوتا جو مرے دل میں خیال
قبر تاریک میں ہوتا نہ اُجالا واعظ

اس کے کہنے کا کیا خیال کریں — یوں تو لیکن کیا نہ کہہ گیا واعظ
اسکی صورت پہ مر مٹو گے تم — جب کبھی ہوگا سامنا واعظ
آگ اس وقت دل میں لگتی ہے — مے کو کہتا ہے جب بُرا واعظ
آکے سب توڑ ڈالے جام و سبو — آج تونے یہ کیا کیا واعظ
آج بھی ہجو اس نے کی مے کی — میں جو آیا تو پی گیا واعظ
آج جاتا رہا مزا انجم — بزمِ یاراں میں آگیا واعظ

اے دل قسم کی شرم و مدارات کا لحاظ
انساں کو رکھنا چاہیئے ہر بات کا لحاظ

اقرار بھی ہے وصل پہ انکار بھی اسے
اس بات کا لحاظ نہ اس بات کا لحاظ

آئے نہ تھے کہ آتے ہی پھر اُٹھ کے چل دیئے
تم نے کیا نہ خاک مری بات کا لحاظ

اوروں پہ ہنسنے والے تجھے چاہیئے ضرور
اِن منتوں کی شرم و مدارات کا لحاظ

اب دیکھو میکدے کو چلے ہیں جناب شیخ
ٹوٹا ہے آج قبلۂ حاجات کا لحاظ

اور بولے نہ کچھ حیلے سے وہ　　　وقتِ رخصت کہا خدا حافظ

اب بنانا ہے مجھے قصرِ سخن　　　جمع کرتا ہوں پئے تعمیر لفظ

اک مریضِ غم کی حالت الحفیظ　　　اور پھر یہ تیری عادت الحفیظ

اگر تم آنا نہیں چاہتے تو مت آؤ　　　ہمارے دردِ محبت کا ہے خدا حافظ

اگر رہائی ملی قید سے تو آئیں گے — وگرنہ شاخ نشیمن تیرا خدا حافظ
ادہر کو جذبۂ دل مجھ کو لے چلا جس دم — قدم قدم پہ یہ آئی صدا خدا حافظ

نقاب حسن نظر سوز سے اُٹھائے ہوئے — وہ آرہے ہیں مرے سامنے خدا حافظ

اثر ہے یہ مری جادو بھری کہانی میں — کہ اب تو ہونے لگا ہے انھیں ہمارا لحاظ

آئے ہو جب سے پڑی ہے آپ کے رخ پر نقاب — وصل کی شب یار اتنا بھی نہیں اچھا لحاظ

ایسا جادو کر دیا اس پر کسی نے اے ہلالؔ — اب تو وہ سرکش کسی کا بھی نہیں کرتا لحاظ

د ــــــ ظ

دیکھتا ہوں ہر طرف تاریکیاں — الحفیظ اے شام فرقت الحفیظ
دیکھ کر کالی گھٹائیں رو دیا — تیرے دیوانے کی وحشت الحفیظ
دیکھئے ہوتے ہیں اب کیا کیا ستم — تیرے کوچے میں ہے تربت الحفیظ
دیکھ کر ان کو پریشاں حال کچھ — میرا رونا وقتِ رخصت الحفیظ
دیکھ کر مجھ کو یہاں آپ آگئے — اس قدر مجھ پر عنایت الحفیظ

ر ــــــ ظ

روزانہ میکدے کے چکر جو مارتا ہے — مے کی وجہ سے شاید ہے بیقرار واعظ
رہ رہ کے میکدہ میں آئی یہ شرم اس کو — لے کر چلا یہاں سے دل داغدار واعظ

رحمت ہے اب خدا کی دو چار جام پی لے
آئی ہے بعد مدت فصلِ بہار واعظ

روتا ہے تو بتوں کے لیے دن ہو یا کہ رات
ایمان کا بھی چاہیے مردِ خدا لحاظ

روز و شب رہتا ہے محبوب کا بیکار لحاظ
عاشقِ زار کا کرتے نہیں دلدار لحاظ

راہ میں آنکھ جھکا لیتے ہیں کرتے ہیں ادب
اس قدر ہے دمِ نظارہ رخسار لحاظ

رہے اک ہاتھ میں مینا، رہے اک ہاتھ میں ساغر
جبھی تو زندگی کا آئے گا تجھ کو مزا واعظ

رکھ نہ کچھ دل میں جو پینی ہے تو آ جا ورنہ
آنکھوں آنکھوں میں نہ کر مجھ کو اشارہ واعظ

روز و شب پیتا تھا اک وہ بھی زمانہ تھا مگر
مے پیے اب تو مجھے ہو گیا عرصہ واعظ

ل ـــ ظ

لا رکھیں عرشِ بریں کو خاک پر
تیرے دیوانوں کی طاقت الحفیظ

لے رہی ہے سادگی انگڑائیاں
آپ کی معصوم صورت الحفیظ

لاکھ غم ہوں پر نہ نالہ کیجیے
الحفیظ اے رسمِ الفت الحفیظ

لا رہے ہیں وہ دوائے زخم دل — مجھ پہ یہ چشمِ عنایت الحفیظ
لے کے آئے ہیں عدو کو میرے گھر — اس قدر مجھ سے عداوت الحفیظ

ن ـــ ظ

نئی صورت سے آئی ہیں گھٹائیں — لے پی لے ایک تو پیمانہ واعظ
نہیں ہوتا ادب تیرا کروں کیا — کہ پایا ہے دلِ دیوانہ واعظ
نہیں کرتا ادب رندوں کا مطلق — ہوا کیا ہے کہیں دیوانہ واعظ
نہیں اب خیریت جام و سبو کی — چلا ہے پھر سوئے میخانہ واعظ

نصیحتیں ہیں دکھانے کے واسطے انجم — یہ دیکھا میں نے کہ پیتا تھا مے کو کل واعظ

نہ جاؤں گا کبھی مسجد میں توبہ — خبر کیا تھی کہ ہے جاگیر واعظ

نہال خوب یہ ترکیب یاد ہے اس کو — ملا جو بزم میں موقع تو پی گیا واعظ

نہ دوں گا یار کو ترجیح تم پر — معاف اب کیجیے تقصیر واعظ

نہ سمجھے ہم کہ خدا ہو گیا ہے کیا واعظ — نصیحتیں ہی کریں جب کہیں ملا واعظ

نہ آئے پھر پلٹ کے مے کدے سے — جو دیکھا جلوۂ جانانہ واعظ

نہ چھیڑ بیٹھے بٹھائے مجھے سنا واعظ — وگرنہ ہوگا ترے حق میں پھر بُرا واعظ

نہ جانے پائے گا خلدِ بریں کو — ہوئے جو رند دامنگیر واعظ

نغمۂ درد سے پُر سوز ہے سینہ واعظ — کیسے دشوار نظر آئے نہ جینا واعظ
نہ تمھیں حسن سے کچھ ربط نہ مے سے ہے لگاؤ — تم کو آتا ہے نہ مرنا ہی نہ جینا واعظ
نہ سہی کیف فنا اور نہ سہی کیف بقا — پر مرے کہنے سے اک جام تو پینا واعظ
نہ کبھی ساحلِ عقبیٰ کا تجھے غم ہوگا — ڈال دے بحر محبت میں سفینہ واعظ

و ــــ ظ

وجد میں ہیں ساکنانِ گلستاں — آگئی ہے فصلِ بہاراں الحفیظ
وائے وحشت ابرِ باراں دیکھ کر — ہاتھ میں ہے پھر گریباں الحفیظ
وحشت دل کو بنا کر رہنما — میں چلا سوئے بیاباں الحفیظ
واہ رے عشق و محبت کا اثر — رات دن رہتا ہوں شاداں الحفیظ
وقت مُردن آگئے بالیں پہ آپ — آپ کا مجھ پر یہ احساں الحفیظ

وہ جسے پڑھتے ہی ہو جائیں خفا — نامہ میں ایسا نہ ہو تحریر لفظ

حافظ

ہوش بے پردہ آرہے ہیں وہ — دیدہ و دل کا اب خدا حافظ
ہوش وہ چاندنی میں نکلے ہیں — ماہ کامل کا اب خدا حافظ
ہوش خنجر لئے وہ آتے ہیں — دست قاتل کا اب خدا حافظ
ہوش پھر قصد ہے کوئے جاناں کی — ہمتِ دل کا اب خدا حافظ
ہوش وہ اُٹھ گئے خفا ہو کر — رنگِ محفل کا اب خدا حافظ
ہوش دل دے کے ہو گئے بیدل — دلِ بیدل کا اب خدا حافظ
ہوش ہے ہر قدم پہ شوق قیام — میری منزل کا اب خدا حافظ

ہوا کرتا ہے مے نوشی سے دل درد آشنا واعظ
اسی میں ہے وفا واعظ اسی میں ہے ادا واعظ
بھلا اک جام سے تیرا بگڑتا بھی ہے کیا واعظ
جہالت کی بھی تو نے آج کر دی انتہا واعظ
ہمیں یہ تو بتا مے سے بگڑتا بھی ہے کیا واعظ
مجھے ڈر ہے نہ آئی ہو کہیں تیری قضا واعظ
ہمیں سے چاہتا ہے اس کو تو کرنا جدا واعظ
نصیحت ہم کو کرتا ہے تجھے سمجھے خدا واعظ
ہے میخواروں کے منہ پر ہی برائی جام رنگیں کی
نہ ہو گا تجھ سا دنیا میں کوئی بے اعتنا واعظ

ہم تو جانتے ہیں سوئے ملکِ عدم | بے کسی اب ترا خدا حافظ
ہو گیا آج بے نقاب کوئی | بے خودی اب ترا خدا حافظ

ہے جو رُخ تیرا سوئے میخانہ | آج کیا یاد آگیا واعظ
ملئے آج آکے دو گھڑی کے لئے | رنگ محفل اڑا گیا واعظ
ہوشؔ سوئے عدم چلے ہیں وہ | شیشہ و جام کا خدا حافظ
ہوشؔ یہ صبح ہے پیام ملال | اب مری شام کا خدا حافظ

ہوشؔ پھر دے مجھے تو دعوت دید | دل بیباک کا خدا حافظ
ہوشؔ چلتی ہیں آندھیاں ہر سو | اب مری خاک کا خدا حافظ

ہوشؔ کون آگیا سر محشر | رونق حشر کا خدا حافظ

ہوشؔ روتا ہے ساری ساری رات | ایسے بیمار کا خدا حافظ
ہوشؔ پردہ کئے وہ بیٹھے ہیں | شوق دیدار کا خدا حافظ
ہوشؔ چاروں طرف ہے تاریکی | اس شب تار کا خدا حافظ

ہوشؔ آنسو مرے نہیں تھمتے | عشق کے راز کا خدا حافظ

ی — ظ

یوں تو نہیں ہے یار کو ہم سے ذرا لحاظ
رکھتا ہے لیکن اپنی سمجھ کر ادا لحاظ

یاں ایک دم کو بہر عیادت وہ آئے ہیں
ان کا ضرور چاہیئے یاں آنے کا لحاظ

یہ سوچتا ہوں کیسے بر آئے مراد دل
واں اہتمام شرم سوا یاں سوا لحاظ

یہ ہے ترا قصور یہ میرا نہیں قصور
توڑا ہے تو نے توڑ کے بند قبا لحاظ

یہ دیکھیئے کہ غیر کی جانب نہ رُخ کیا
شاباش شرمِ یار تجھے مرحبا لحاظ

یہ آرزو ہے کہ پھر ہو دوبارہ موت مری
اسی طرح سے کہیں اقربا خدا حافظ

یہ مے خانہ ہے کچھ مسجد نہیں ہے
چلے گی یاں نہ کچھ تدبیر واعظ

یہ حالت ہے کہ اس کو بزم میں آنے نہیں دیتی
ہوا باتوں سے اپنی آپ رسوا کو بکو واعظ

بہ مے خواروں کی نغمہ ہے ہم لڑیں گے آج محفل میں
خدا محفل میں رکھ لے آج تیری آبرو واعظ

یار ہے آج محو آرائش
اب مری زیست کا خدا حافظ

یاسؔ کانٹے ہیں لاکھ منزل میں
میرے چھالوں کا ہے خدا حافظ

یاسؔ کس بات کی ہے فکر مجھے
جب مرا ہو گیا خدا حافظ

یہ کہہ کے شمع بھی گل ہو گئی شب فرقت
کہ مرنے والے تر اب ہے بس خدا حافظ

یاسؔ ان کو نظر نہ ہو جائے
حسن محبوب کا خدا حافظ

ص ــــ ظ

صباؔ توہین مے کام ہے بس
بھلا پھر خاک ہو توقیر واعظ
صباؔ ہر بات میں مے کی برائی
کہاں تک ہم سنیں تقریر واعظ
صباؔ کی بات تو سلجھی ہوئی ہے
نہ کر الجھی ہوئی تقریر واعظ
صباؔ کھینچا ہے یوں نقشہ دہاں کا
کہ گویا خلد ہے تعمیر واعظ
صباؔ ہر اک ہے مے نوشی کا طالب
چلے گی یاں نہ کچھ تدبیر واعظ

صبا رہتا ہے مے خواروں سے بدظن ‏‏ ‏‏ ‏‏ ‏‏ بھلا پھر کیا کریں توقیر واعظ

ظ ــــ ظ

ظفرؔ کی بزم میں کرتا ہے تو جو ہجو مے ظالم
برائے نام تو کچھ چاہیئے شرم و حیا واعظ

ظفرؔ کو روکتا ہے کس لئے بادہ پرستی سے
اسے تو صرف مے نوشی کا ہے اب آسرا واعظ

ظفرؔ کے سامنے ہر بار اس کا ذکر کرنے سے
بتاؤں کس طرح تجھ کو کہ کیا یاد آگیا واعظ

ظفرؔ میری طبیعت ہی نہیں کرتی ہے پینے کو
کچھ اس صورت سے مجھ کو آج کچھ سمجھا گیا واعظ

ظفرؔ کی زندگی چین و سکوں سے کس طرح گزرے
نئے فتنے جگاتی ہے نگاہِ فتنہ گر واعظ

ظفرؔ کو ایک ساغر نے ہی اتنا کر دیا بے خود
نہ کچھ اپنی خبر واعظ نہ کچھ تیری خبر واعظ

ا ــــ ل

اے صنم نا آشنائے دردِ دل ‏‏ ‏‏ ‏‏ ‏‏ کاش ہوتا مبتلائے دردِ دل

اللہ اللہ انتہائے دردِ دل — مر گیا میں کہہ کے ہائے دردِ دل
اک نظر جب یار نے ڈالی دہر — ہو گیا میں مبتلائے دردِ دل
اللہ اللہ عشق کی سرگرمیاں — ابتدا ہے انتہائے دردِ دل
اللہ اللہ میری آہوں کا اثر — کر رہے ہیں وہ دوائے دردِ دل
آج آئے ہیں وہ پرسش کے لئے — ہے سکوں مجھ کو بجائے دردِ دل
آج ان کی یاد میں بیٹھا ہوں میں — اپنے سینہ سے لگائے دردِ دل
آج کرتا ہے طلب اس شوخ کو — آئی ہے شاید قضائے دردِ دل
آج دردِ دل نے کر ڈالا ہلاک — ہو گئی لیکن دوائے دردِ دل
آج پوری آرزو ہو جائے گی — گر سنیں گے وہ صدائے دردِ دل
آج اس انداز سے کرتے ہیں ظلم — ہو رہی ہے انتہائے دردِ دل
آج ان کا ہاتھ ہے دل پر مرے — کس طرح کوئی چھپائے دردِ دل
آج وہ خاموش ہو کر چل دیئے — ان کو کیا کوئی بتلائے دردِ دل
آج کر کے بسملِ تیغ ادا — پوچھتے ہیں مجھ سے جلائے دردِ دل
آج وہ حد سے سوا کرتے ہیں ظلم — ہو رہی ہے انتہائے دردِ دل
آج یہ ان کی کرشمہ سازیاں — مٹ رہا ہے بے مثلائے دردِ دل
آج ان کے در پہ ہے یوں یہ ہجوم — کر رہے ہیں وہ عطائے دردِ دل

ی ــــ ل

یار تو ہے دشمن جان و جگر — کیا کرے کوئی دوائے دردِ دل

یہ تری الفت میں حالت ہو گئی
ہر نفس ہے اک صدائے دردِ دل

یار کو ضد ہو گئی کیا کیجئے
کس طرح کوئی دکھائے دردِ دل

یار کے آتے ہی دردِ دل نہیں
یہ بھی تھی انجمؔ ادائے دردِ دل

یہ مرا الفت میں عالم ہو گیا
اب نہیں مٹتا مٹائے دردِ دل

یار نے کچھ اس طرح دیکھا مجھے
ہے سکونِ دل کو بجائے دردِ دل

یک بیک بیمار رخصت ہو گیا
منہ سے جب نکلا کہ ہائے دردِ دل

ل ــــ ن

نرالی شان کا ہے میرا قاتل
تسلی دے رہا ہے کر کے بسمل

نہ پوچھو کیوں تڑپتا ہے مرا دل
تمہاری تیغِ ابرو کا ہوں گھائل

نہ دیکھا اک نظر بھی کر کے بسمل
ذرا دیکھے کوئی اندازِ قاتل

نہ دیکھا وقتِ آخر اپنا قاتل
تھکا ہوں میں بھی آ کر نزدِ منزل

نصیبے جاگ اٹھے اب بحرِ غم میں
نظر آنے لگا ہے مجھ کو ساحل

ہ ــــ ا

انجم کی بدنصیبی اللہ رے بدنصیبی
خاموش ہو گئے وہ سن کر مرا فسانہ

انجمؔ وہ رو برو جب بیٹھے ہمارے آ کر
بدلا کئے وہ تیور بدلا گیا زمانہ

انجمؔ کوئی ستم کی کچھ حد نہیں ہے شاید
صیاد نے جلایا گلشن میں آشیانہ

انجم جو برق چمکی تو ہم کو یاد آیا
تھا گلستاں میں شاید اپنا بھی آشیانہ

ان کا قصدِ خرام ارے توبہ ۔۔۔ حشر کا اہتمام ارے توبہ
ان کے ہاتھوں میں جام ارے توبہ ۔۔۔ لب پہ توبہ کا نام ارے توبہ
اک جھلک میں تمام کر ہی دیا ۔۔۔ جلوۂ ناتمام ارے توبہ
اپنی زلفیں وہ کھولے بیٹھے ہیں ۔۔۔ روح پرور یہ شام ارے توبہ
آہ غم کی یہ ظلمتیں انجمؔ ۔۔۔ روشنی ہے حرام ارے توبہ

ن ـــــــ ہ

نامرادوں کی شام ارے توبہ ۔۔۔ رنج و غم کا مقام ارے توبہ
ناتوانی و دوریٔ منزل ۔۔۔ ہر قدم پر قیام ارے توبہ
نہ ہوئی ختم صبحِ محشر تک ۔۔۔ روزِ فرقت کی شام ارے توبہ
نظریں حل ہو رہی ہیں جلوے میں ۔۔۔ تم ہو بالائے بام ارے توبہ
نظریں بھی تلملائی جاتی ہیں ۔۔۔ جلوے ہیں ان کے عام ارے توبہ

ہ ـــــــ ہ

ہے قیامت کی رات ہجر کی رات ۔۔۔ نیند تک ہے حرام ارے توبہ
ہے جہاں فنا میں حشر بپا ۔۔۔ لے لیا کس کا نام ارے توبہ
ہر قدم پر ہے پائمال اک دل ۔۔۔ تیری مشقِ خرام ارے توبہ
ہے نظر میں مآلِ طورِ کلیم ۔۔۔ پھر بھی شوقِ کلام ارے توبہ
ہیں یہ اصنامِ دہر سب فانی ۔۔۔ میں کروں احترام ارے توبہ

ی ــــــ ہ

یوں لٹی ہے شباب کی دولت　　حسن ہے بے نقاب ارے توبہ

یاس کا اہتمام ارے توبہ　　تیری فرقت کی شام ارے توبہ
یہ میں کس طرح سے یقین کروں　　وہ مرے سوگوار ارے توبہ
یاس چھوڑ دیہ میکشی کا شوق　　توبہ توبہ یہ کام ارے توبہ

یاں اور بھی کچھ درد سوا ہوتا ہے ہمدم
خاموش جو ہو جاتے ہیں سن کر وہ فسانہ

یاں ضعف سے باقی نہیں اب طاقتِ گفتار
سننے کے لئے آئے ہیں وہ میرا فسانہ

یاں ہو گیا دل دیکھتے ہی دیکھتے بسمل
کیا خوب ترے تیر نظر کا ہے نشانہ

یاں ہوتا ہے افسوس تمنا کا مرے خوں
کرتے ہیں شب و روز وہ مہندی کا بہانہ

یاروں کی جدائی نے اسے کر دیا دلچسپ
سنتے ہیں بڑے شوق سے سب میرا افسانہ

یہاں سے پھر بیاں ہوتا ہے دردِ دل کا افسانہ
چلا ہے پھر بیابانوں کی جانب تیرا دیوانہ
یہاں اب تیری محفل میں رسائی کس طرح سے ہو
میں مفلس بے نوا ہوں اور ترا دربار شاہانہ
یہ قدرت ہو گئی ہے اب تو تیری یاد میں ساقی
جہاں میں جھوم کر بیٹھوں وہیں بن جائے میخانہ
یہ مانا خلق میں ہر طرح سے بدنام ہوں لیکن
اسی پر ناز ہے مجھ کو کہ میں ہوں تیرا دیوانہ

کرسی نامہ

سید علی سجّاد انجم جعفری پھپھوندی

۱۔ سید علی سجاد جعفری ۲۔ سید امیر حسن ۳۔ سید مرتضیٰ حسن ۴۔ سید انتظام علی ۵۔ سید یاور علی ۶۔ سید امداد علی ۷۔ سید زبیر علی ۸۔ سید گل محمد ۹۔ سید الہ ہار ۱۰۔ سید غفّار ۱۱۔ سید رحیم ۱۲۔ سید اسحاق ۱۳۔ سید کبیر الدین ۱۴۔ سید جلال الدین ۱۵۔ سید محمود ۱۶۔ سید محمد ۱۷۔ سید کبیر الدین ۱۸۔ سید بدّی ۱۹۔ سید شرف الدین ۲۰۔ سید جمال الدین ۲۱۔ سید شمس الدین ۲۲۔ سید محمد ۲۳۔ سید قلندر ۲۴۔ سید احمد ۲۵۔ سید سلطان ۲۶۔ سید جعفر ۲۷۔ سید ابو طالب ۲۸۔ سید حسن ۲۹۔ سید علی عریضی ۳۰۔ سید محمد مامون ۳۱۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام۔

ہارون رشید کے زمانہ میں مدینہ منورہ سے سید محمد مامون کی اولاد ہجرت کرکے شیراز (ایران) آگئی تھی۔

شائع کردہ سیّد امیر حسن اختر جعفری
۲۰ ۔ ایچ ۔ کوچہ میر ولی ۔ رضویہ سوسائٹی ۔ کراچی ۱۸

قیمت ——— ۲ روپے پچاس پیسے

تاریخ اشاعت .... یکم جولائی ۱۹۷۱ء
حقی آرٹ پریس لیاقت آباد ۔ کراچی